وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ

سہ ماہی البیان کراچی

سلسلہ نمبر 25

تاریخ اجراء: اکتوبر 2021ء

اپریل تا جون 2021ء بمطابق رمضان تا ذی القعدہ 1442ھ

فہرست مضامین

المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر

AL-Madina Islamic Research Center

جامع مسجد سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، ڈیفنس فیز 4، 11 کمرشل اسٹریٹ نزد نثار شہید پارک وگذری پولیس اسٹیشن کراچی۔

Ph:+92-21-35896959

Mob 03322135693

WEBSITE:

WWW.ISLAMFORT.COM

E-MAIL

albayanmirc@gmail.com

ادا ریہ

خواہش نفس کی بیماری

الشیخ سعود الشریم حفظہ اللہ [1]



مسنون خطبہ کے بعد: اے لوگو! ایک بہت مشہور مقولہ زبان زد عام ہے۔عہد پارینہ کے لوگ بھی اسے نسل در نسل نقل کرتے آئے ہیں، مشرق ومغرب میں اس کی صدائیں سنی جاتی ہیں، اخلاف کو اسلاف سے علمی ورثہ میں ملا۔ یہاں تک کہ کسی تنازعہ میں اس مقولہ پر بحث اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ اتنا محکم مقولہ ہے کہ اس نے کسی بھی جبروزیادتی کے آگے حد بندی کر دی ہے۔ اس نے شہوات وشبہات کو دیواروں سے دے مارا۔ ہر کج روی اختیار کرنے والے کیلئے وہ ضرب کاری ثابت ہوا۔ اور باحثین ومحققین جو حق وعدل کے متلاشیان ہیں، توازن واعتدال کے قائل ہیں ان کے ایوانوں میں اس کی صدا گونج رہی ہے۔





یہ کلمات بظاہر اپنی بناوٹ کے اعتبار سے مختصر مگر معنی کے حساب سے بڑے دور رس ہیں۔ یہ وہ کلمات ہیں جو ابن عباس رضی اللہ عنہ، اور مجاہد، اور امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہیں: کہ



"لَيْسَ أحدٌ بعدَ النبيِّ إلا يُؤخَذُ من قولِه ويُترَك إلا النبيَّ"

"نبی ﷺ کے بعد ہر ایک کی بات کو لیا بھی جاتا ہے اور چھوڑا بھی جا سکتا ہے صرف نبی ﷺ کی بات کو کہ اسے لیا جا سکتا ہے چھوڑا نہیں جا سکتا"۔



اللہ کے بندو یہ کتنا بہترین میزان ہے، کیا اعلی عدل اور عظیم فیصلہ ہے!

اے مسلمانو! ہم آگ آلودہ زمانے میں بس رہے ہیں۔ اس دور کی نمایاں علامات واثرات میں میڈیا کا ظاہری جوش اور ولولہ ہے۔جس نے دور والے کو قریب، اور ناآشنا کو آشنا کر دیا۔ یہ میڈیا اپنی اس انتہا اور عروج کو پہنچ گیا ہے کہ جو فکری، علمی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی ودیگر آراء کا اکھاڑہ اور آئینہ وپیمانہ بن چکا ہے۔

---

[1] امام وخطیب مسجد الحرام

دوررس نظراور بیدار عقل کے مشاہدہ سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس میڈیائی جوش وخروش کا لوگوں کے احساسات کو متاثر کرنے،ان کے افکار وخیالات پر اثرانداز ہونے میں کتنا کلیدی کردار ہے ،جولوگوں پر کتنی جلد اثرانداز ہوتا ہے۔اس (میڈیا) کاانحصار واعتماد جذباتی تعبیرات وخیالات پر ہوتا ہے چاہے وہ خیالات وتعبیرات شرعی دلائل اور بنیادی عقلی اصولوں سے عاری ہی کیوں نہ ہوں۔ نیزاس میڈیائی ولولے کاانحصار اکثروبیشتر جھوٹے گمان،بے حقیقت دہشت انگیزی،اور من مستی وخواہش پرستی پر ہے جو چند ارباب قلم ودانش اور میڈیائی گوریلاوارکی طرز سے ان کے دلوں پر سوار ہے۔اس میدان میں ان کا اہنماصرف پیشکش میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانااور قارئین وناظرین وسامعین کی ہمدردی حاصل کرنا،اور عامۃ الناس پرتلبیس کرنا،حقائق کومسخ کرکے پیش کرنا ہے۔ایسے تمام کام یہ لوگ محض ایک ہی نقطہ نظر کی ترجمانی کی صورت میں کرتے ہیں۔اور یہ ترجمانی اکثریت اور ارباب قوت واقتدار کے نقطہ نظر کی ترجمانی کی صورت میں ہوتی ہے۔حالانکہ یہ ایسی خواہش اور ایسا انتخاب ہے کہ جوکسی بھی منصفانہ قوت اور ممکنہ رکاوٹ کے تابع نہیں ہے۔یہی وہ بات ہے جو اصحاب عقل ودانش اور ارباب فطرت سلیمہ کو غم زدہ کردیتی ہے۔ایسی ہی صورت حال کے بارے میں کسی نے کہا تھا کہ:

وَيْلٌ للشَّجِيِّ مِنَ الخَلِيِّ ''غمزدہ وپریشان حال کے لیے بے غمزہ وبے فکر کے ہاتھوں تباہی ہے''۔

اللہ کے بندو یہیں سے خواہشاتی آمریت کا آغاز ہوتا ہے۔اور عدل وانصاف اور وسطیت کا شیرازہ بکھرتا ہے۔جی ہاں! وسطیت تو وہ ہے جو حق ہو،چاہے جہاں بھی ہو۔دو امور کے درمیاں کا راستہ وسطیت نہیں۔جیسا کہ بعض کج فہم لوگ جو وسطیت کے معنیٰ ومفہوم سے ناآشنا ہیں سمجھتے ہیں کہ طرفین کے درمیان کاراستہ وسطیت ہے۔

جی ہاں اے مسلمانو! اس وقت عدل وانصاف کے دور میں اور حقیقت کی کھوج وتلاش میں ان خواہشات کا راج ہے۔یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ اگر کوئی شخص کسی معاشرہ کے معیار اور منزلت کو پرکھنے کا خواہاں ہوتا ہے کہ یہ معاشرہ ثقافتی، فکری،اور علمی لحاظ سے کس مقام پر فائز ہے؟ تو وہ سب سے پہلے اس معاشرہ کے قلم نگار، مفکرین اور ثقافتی لوگوں کے خواہشاتی معیار اور مقام ومنزلت کو قریب سے،دور سے،اور قول

وفعل غرض ہر اعتبار سے دیکھتا اور جانچتا ہے۔

اللہ کے بندو! جس خواہش اور اختیار کی بات ہم یہاں کر رہے ہیں یہ وہ خواہش واختیار ہے جس میں کم خطرے کے پہلو کو حقیقت کالبادہ پہناتے ہوئے زیادہ پر خطر پہلو سے بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ: حقائق ومعاملات میں محض خواہش نفس کو سامنے رکھنا۔ اور جو حقائق خواہش نفس کے ناموافق ہوں ان سے پہلوتہی اختیار کرنا اور نظرانداز کر دینا ہے۔ اور بسا اوقات محض اپنی خواہش نفس کو اور ذاتی مفاد ومصلحت کو سامنے رکھنا۔ چاہے شریعت ومنطق سلیم میں اس کی کوئی حیثیت اور وقعت نہ ہو۔ یا پھر اپنی خواہش نفس اور ذاتی مفاد ومصلحت سے ٹکرانے والے حقائق کے بارے میں دہشت انگیزی اور پروپیگنڈا کرنا۔ چاہے وہ دلالت ومنطق میں کتنا ہی وزن کیوں نہ رکھتے ہوں۔

اللہ کے بندو! یہی وہ مکروہ عادت ہے کہ جو امتیں بھی اس میں ملوث ہوئیں وہ اللہ کے غضب کی مستحق ٹھہریں۔ جیسا کہ فرمان باری تعالی ہے:

﴿أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ﴾(البقرة: 85)

ترجمہ ”توکیا تم بعض کتاب پر ایمان لاتے ہوئے اور بعض کا کفر کرتے ہو۔“

اسی کے بارے میں سورہ مطففین میں فرمایا:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ﴾(المطففين: 3-1)

ترجمہ:” خرابی ہے گھٹانے والوں کی۔ وہ لوگ کہ جب ناپ کر لیں لوگوں سے تو پورا بھر لیں۔ اور جب ناپ کر دیں ان کو یا تول کر تو گھٹا کر دیں۔“

جی ہاں، یہ وہ خواہش ہے جو انتخاب اور جانبداری کو جہاں ذاتی مفاد ہوتا ہے اسی طرف لے جاتی ہے ۔ جبکہ حقیقت میں حق کی پیروی کرنا ضروری ہوتا ہے چاہے نفس وجان پر وہ کتنا ہی شاق اور مشکل کیوں نہ گذرے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِن لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ﴾ (التوبۃ: 58)

اور بعضے ان میں وہ ہیں کہ تجھ کو طعن دیتے ہیں خیرات بانٹنے میں سو اگر ان کو ملے اس میں سے تو راضی ہوں اور اگر نہ ملے تو پھر وہ ناخوش ہو جائیں۔"

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان لوگوں کی مذمت کی ہے جن کے پاس اگر حق بات ان ذرائع سے معلوم ہو جن سے انہیں بغض وعناد ہے تو اسے رد کر دیتے ہیں۔ اور اگر اسے وہ لوگ پیش کریں جن سے انہیں محبت ہے تو قبول کر لیتے ہیں۔ یہ تو اُس امت کا کردار و گفتار ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا ہے۔

اللہ کے بندو! معاملہ یہاں سے خطرناک صورت اختیار کر جاتا ہے جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے کہ اختلافی معاملہ میں وہاں سے فیصلہ کرایا جاسکے، تو یہاں ان لوگوں کی مکروہ خواہش ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہاں تو یہ لوگ حقِ شرعی کی ہیبت اور اس کی طرف رجوع کے حکمِ (شرعی) کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے افراد کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٤٨﴾ وَإِن يَكُن لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ﴿٤٩﴾ أَفِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ بَلْ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٥٠﴾﴾ (النور:50-48)

ترجمہ: "جب یہ اس بات کی طرف بلائے جاتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول ان کے جھگڑے چکا دے تو بھی ان کی ایک جماعت منہ موڑنے والی بن جاتی ہے۔ ہاں اگر انہی کو حق پہنچتا ہو تو مطیع و فرماں بردار ہو کر اس کی طرف چلے آتے ہیں۔ جب فیصلہ ان کے خلاف ہونے کا امکان ہوتا ہے تو اس سے اعراض و گریز کی وجہ بیان کی جارہی ہے کہ یا تو ان کے دلوں میں کفر و نفاق کا روگ ہے یا انہیں نبوت محمدی میں شک ہے یا انہیں اس بات کا اندیشہ ہے کہ ان پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ ظلم کرے گا، حالانکہ ان کی طرف سے ظلم کا کوئی امکان ہی نہیں بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ خود ہی ظالم ہیں۔۔"

امام دارمی رحمہ اللہ نے جب بعض اہل بدعت اور خواہش پرستوں پر رد کیا جنہوں نے مومنین کی روز قیامت

اللہ تعالیٰ کی زیارت کے اثبات والی نصوص کا انکار کیا، پھر مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ایک ضعیف اثر کو بنیاد بنانے لگ گئے، جس میں انہوں نے رب تعالیٰ کے اس فرمان:

﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ (القیامۃ: 22،23)

ترجمہ: ''کتنے منہ اس دن تازہ ہیں۔ اپنے رب کی طرف دیکھنے والے۔''

اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ لوگ اپنے رب کے ثواب کے منتظر ہوں گے۔

اس پر امام دارمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''کیا تم لوگوں کا یہ دعوی نہیں کہ تم ان آثار کو قبول نہیں کرتے اور نہ انہیں حجت سمجھتے ہو، تو پھر امام مجاہد سے مروی اس اثر کو حجت کیوں بناتے ہو، محض اس وجہ سے کہ اس کے تمہیں اپنے باطل نظریئے کی تائید مل گئی ہے۔ جبکہ تم نے تو رسول اللہ ﷺ کے آثار اور آپ کے اصحاب اور پھر تابعین کے آثار اگر تمہارے مذاہب کے مخالف آئیں تو ان کو محض شک کی بنا پر ترک کر دیا ہے یہ محض شذوذ، انفرادیت اور خواہش پرستی کی امنگوں کے باعث تم سے ایسا عمل سرزد ہوتا ہے۔

اللہ کے بندو! خواہش پرستی یہی ہے کہ حق کو صرف اس وقت قبول کرنا جب اس میں شخصی مقصد اور فکری مصلحت نظر آئے۔ اگر مقصد نہیں تو اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ بلکہ اصلاح نفس کی ضرورت اور برائی کی بیماری میں مبتلا ہونے کے باوجود حق کو رد کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ خواہش پرستی کی بیماری میں مبتلا بعض لوگ صرف یہی یاد رکھتے ہیں کہ اللہ غفور و رحیم ہے اور یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ شدید العقاب بھی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ خواہش نفس کی بیماری میں مبتلا لوگ اصلاح پسندی، حکمرانوں کے احتساب اور امر بالمعروف کی فرضیت کے دلائل تو یاد رکھتے ہیں، مگر نیکی کے کاموں میں حکمرانوں کی سمع و طاعت نیز جماعۃ المسلمین اور ان کے امام کو لازم پکڑنے کے دلائل سے صرف نظر کر جاتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ وہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو تو پڑھتے ہیں۔

﴿وَإِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا فِرْعَوْنُ مَثْبُورًا﴾ (الإسراء: 102)

ترجمہ: ''اور میرے خیال میں فرعون تو غارت ہوا چاہتا ہے۔''

اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ بھی فرمایا کہ:

﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَيِّنًا﴾ (طہ: 44)

ترجمہ: ’’سو کہو اس سے بات نرم شاید وہ سوچے یا ڈرے۔‘‘

ہم دیکھیں کہ یہ لوگ ذہنی طور پر اتنے روبہ زوال ہیں اور ایسی فکری ونظریاتی پستی میں مبتلا ہیں، کہ اگر کوئی مسجد میں چوری کرے تو مطالبہ کرتے ہیں کہ مسجد کو گرادینا چاہیئے۔ اور اگر کوئی باپردہ عورت خیانت اور دھوکہ اور جعل سازی کی مرتکب ہو تو کہتے ہیں کہ اس کا پردہ اتارنا واجب ہے۔ تو ان لوگوں نے نہ تو چور کا ہاتھ کاٹنے کا، اور نہ اس خیانت کرنے اور دھوکہ دینے والی کو تعزیراتی سزا دینے کا مطالبہ کیا بلکہ مسجد کو گرانے اور پردہ اور حجاب اتارنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ یہی وہ خواہشاتی ناسور ہے جو ان پراگندہ ذہنوں پر مسلط ہے۔

اس لئے خواہش پرستوں کی یہ نشانی رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس نفس کو قتل کرنا حرام ٹھہرایا ہے اسے قتل کر دیتے ہیں۔ اور پھر پوچھتے ہیں کہ حرم میں مکھی مارنے کا کیا حکم ہے؟! ۔ ایسے من پسند لوگوں کی لسان حال یہ صدا لگا رہی ہوتی ہے کہ۔

’’أصُمُّ عن الأمر الذي لا أريده وأسمع خلقَ الله حين أشاء۔‘‘

’’جس امر سے مجھے کوئی غرض نہیں اس سے میں بہرہ ہو جاتا ہوں۔ اور جب اپنی ضروت ہوتی ہے تو چاہوں تو تمام خلق کی بات سننے کو تیار ہوتا ہوں۔‘‘

انہی خواہش پرستوں کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ آنکھ کی کنک پر نظر رکھتے ہیں، اور بڑے سے بڑے ورم سے پہلو تہی اختیار کر جاتے ہیں۔

ایسے لوگوں کا شیوہ دورخی اختیار کرنا، ذہنی پراگندگی اور اخلاقی بے ہودگی کا طرزِ عمل اختیار کر کے نفس وذات کو دھوکہ دینا ہے، اور نفس اور معاشرے کو فکری ونظریاتی خوابِ غفلت میں مبتلا کرنا ہے، یہ سب محض خواہش نفس کی تسکین وتسلی کے لئے کیا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کا ہدف محض نفس ہوتا ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اور نبی ﷺ کے منع کردہ کام سے بچنا۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا

وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥١﴾ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴾(النور :52-51)

”ایمان والوں کا قول تو یہ ہے کہ جب انہیں اس لئے بلایا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ان میں فیصلہ کر دے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔ یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ جو بھی اللہ تعالیٰ کی، اس کے رسول کی فرماں برداری کریں، خوف الٰہی رکھیں اور اس کے عذابوں سے ڈرتے رہیں، وہی نجات پانے والے ہیں۔“

دوسرا خطبہ

<u>حمد وثنا کے بعد:</u> یہ اچھی طرح جان لو کہ خواہش پرستی ایک مذموم صفت اور بڑے عار وعیب کا مظہر ہے۔ خواہش پرستی سے جب کوئی متصف ہوتا ہے تو وہ سچائی اور توازن کھو بیٹھتا ہے۔ گویا وہ کہ اربابِ عقل ودانش واصحاب فطرت سلیمہ کے سامنے اپنا مقام ومعیار کھو بیٹھتا ہے۔ الغرض۔ نہ تو خواہش پرست والد، نہ خواہش پرست دوست اور نہ ہی خواہش پرست معلّم کامیاب ہوسکتا ہے نہ اسے فلاح مل سکتی ہے۔ اسی طرح طالب علم، مفکر، کاتب، اور ناصح اور سیاست دان کا بھی یہی حال ہے

جو شخص خواہش پرستی کی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو گردشِ زمانہ ایک نہ ایک روز اس کا پردہ فاش کر دے گی، کیونکہ جو اپنی خواہشات کی آگ کے پیچھے اڑان بھرتا ہے۔ تو کل اس کو اس سے مکمل برعکس صورت حال کا سامنا کرنا ہوگا اور اس وقت کوئی چارہ جوئی کام نہیں آئی گے۔ اس لئے آپ ﷺ نے ایک صحابی کو یہ وصیت کرتے ہوئے فرمایا کہ

”ولا تكلَّمْ بكلامٍ تعتذِر منه غدًا“ [1]۔

ترجمہ: ”آج ایسی بات نہ کرو کہ جس سے کل تمہیں معذرت پیش کرنی پڑے۔“

اللہ کے بندو! اگر ہم اپنے معاشرہ سے خواہش پرستی کی بیماری کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ دو باتوں کو ضرور سامنے رکھیں۔

اول: واقعہ کا صحیح نقطہ نظر پیش کریں۔

---

[1] رواہ أحمد وابن ماجہ

دوم: واقعے کے تمام پہلوؤں کی صحیح کو رتیج کریں۔

نبی اکرم ﷺ نے ان دو امور کی عملی تطبیق ہمیں اس نوجوان کے واقعہ میں کر کے بتادی۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ: ''ایک شخص آپ ﷺ کے پاس تشریف لایا اور زنا کرنے کی اجازت طلب کی اور آپ ﷺ نے اس سے کہا کہ ''أتحبُّه لأمِّك؟''، کیا اپنی ماں کے لئے ایسا کرنا پسند کرتے ہو؟۔ کہنے لگا نہیں میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں اللہ کی قسم نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''ولا الناسُ يُحبُّونه لأمَّهاتهم۔''

تو لوگ بھی اپنی ماؤں کے ساتھ اس طرح کیا جانا پسند نہیں کرتے۔ پھر آپ نے اس سے اس کی بیٹی، بہن، چچی، خالہ کے بارے میں بھی یہی سوال دہرایا۔

نبی اکرم ﷺ کا اس نوجوان کے ساتھ موقف ہمارے لئے معاملات میں فیصلہ کرنے، اور انہیں ڈیل کرنے کے حوالے سے ایک بنیادی اور رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہ اس طرح کے معاملات میں دو بنیادی وضروری عناصر کا ہونا لازمی ہے۔ ان دو عناصر میں

ایک: عدل کا عنصر۔

دوسرا: علم کا عنصر۔

کیونکہ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے تمام شعبہ ہائے زندگی میں لوگوں کی ہدایت ورہنمائی کو اپنا ہدف بنائیں، نہ کہ انہیں مشتعل کرنے اور ناراض کرنے اور گمراہ کرنے کی تگ ودو میں رہیں۔ اور ہمیں چاہئے کہ رہنمائی وآگاہی کو اپنا شعار بنائیں نہ کہ لوگوں میں اضطراب واشتعال کی فضا پیدا کریں۔ نیز نصیحت کی کاوش کریں نہ کہ لوگوں کو شرمسار کرنے اور مذمت کرنے کی طرز کو اپنائیں۔ اور لوگوں کے سامنے حقیقت بیان کریں نہ کہ اپنے ذاتی خیالات واحساسات کی ترجمانی کریں۔ ہمیں حق پر غیرت کرنی چاہئے نہ کہ اپنی ذات کی کامیابی کی جستجو میں لگے رہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نفع کا اثر مقصد ونیت کے اثر سے ظاہر ہوتا ہے۔ جب نیت میں فطور اور قصد میں آمیزش ہو جائے تو پھر خواہش پرستی سے کسی طرح بھی خلاصی ممکن نہیں ہوتی۔ امام وکیع بن جراح فرماتے ہیں: ''اہل علم ہر بات لکھتے ہیں چاہے وہ ان کے حق میں

ہو یا ان کے خلاف ہو، اور اہل اھواء و بدعت وہی بات لکھتے ہیں جو ان کی حمایت و تائید میں ہوتی ہے۔"

ابن جوزی رحمہ اللہ اپنے دور کے چند خواہش پرستوں اور من پسندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

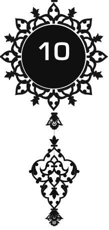
"اگر کوئی ضعیف حدیث ان کے مذہب کے مخالف آجائے تو یہ لوگ اس حدیث کا سببِ ضعف بیان کرتے اور نقد کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی ضعیف حدیث ان کے مذہب کے موافق مل جائے تو اس پر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں اور وجہ طعن بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ سب وہ دینی پیروی میں کمزوری اور خواہش نفس کے غلبہ کی وجہ سے کرتے ہیں۔"



اللہ کے بندو! جو اللہ اور اس کے بندوں میں اپنی مقبولیت چاہتا ہے! اسے چاہئے کہ وضاحت و صداقت اور سچائی کو اپنا شعار بنائے اور ہلاک کرنے والی خواہش پرستی سے بچے۔



امام بخاری رحمہ اللہ کی کیا ہی سچی صفت بیان کی گئی ہے کہ جب انہوں نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں زکاۃ کا مسئلہ ذکر کیا تو۔ بخاری کے شارحین لکھتے ہیں کہ: اس مسئلہ میں امام بخاری نے احناف کی موافقت کی ہے جبکہ اکثر مسائل میں وہ ان کے مخالف ہیں۔ لیکن اس مسئلہ میں دلیل حنفیہ کے موافق ہے اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے ان کے مذہب کی موافقت و تائید کی۔



﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا ۚ وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا﴾ (النساء:135)



ترجمہ: "اے ایمان والو! عدل و انصاف پر مضبوطی سے جم جانے والے اور خوشنودی اللہ کے لئے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ، گو وہ خود تمہارے اپنے خلاف ہو یا اپنے ماں باپ کے یا رشتہ داروں عزیزوں کے۔ شخص اگر امیر ہو تو اور فقیر ہو تو دونوں کے ساتھ اللہ کو زیادہ تعلق ہے۔ اس لئے تم خواہش نفس کے پیچھے پڑ کر انصاف نہ چھوڑ دینا، اور اگر تم نے کج بیانی کی یا پہلو تہی کی، تو جان لو کہ جو کچھ تم کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔"

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں الحاد اور اس کی صورتیں

خالد حسین گورایہ [1]

الحاد کے معنیٰ ہیں

کسی ایک طرف مائل ہونا۔اسی سے لحد ہے جو اس قبر کو کہا جاتا ہے جو گڑھے کے اندر ایک طرف بنائی جاتی ہے۔دین میں الحاد اختیار کرنے کا مطلب کج روی اور گمراہی اختیار کرنا ہے'' ۔[2]

اسماء،اسم کی جمع ہے جس سے مراد:اللہ تعالیٰ کے وہ پیارے نام ہیں جو باری تعالیٰ نے خود اپنے لئے منتخب کئے ہیں اور اپنے رسول ﷺ اور کتابِ عظیم کے ذریعے کچھ ہمیں بھی بتلائے ہیں۔اسی طرح صفات صفت کی جمع ہے جس سے مراد: اللہ تعالیٰ کی وہ بلند وبرتر صفات ہیں جن میں اس کا کوئی شریک نہیں جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾(الشوریٰ:11)

'' اس جیسی کوئی چیز نہیں وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

اہل سنت والجماعت کا اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے باب میں یہ عقیدہ ہے کہ '' اللہ تعالیٰ کے تمام ناموں اور تمام صفات پر حقیقی معنیٰ میں بغیر تمثیل،بغیر تشبیہ،بغیر تکییف،بغیر تعطیل اور بغیر تحریف کئے ایمان لانا، اسی طرح وہ صفات جو اللہ نے خود ہمیں بتائی ہیں یا نبی کریم ﷺ نے بتائی ہیں جیسے استواء،نزول،ید وغیرہ ان پر بھی بلا تمثیل وتشبیہ وتحریف وتعطیل ایمان رکھنا ہے۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾(الشوریٰ:11)

---

[1] نائب مدیر المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

[2] تفسیر احسن البیان ص ۳۹۰ مطبوعہ دار السلام لاہور

''اس جیسی کوئی چیز نہیں ' وہ سننے اور دیکھنے والا ہے''

یعنی کائنات میں اللہ جیسی کوئی چیز نہیں 'نہ ذات میں نہ صفات میں۔ پس وہ اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ واحد اور بے نیاز ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد کی صورتیں



اللہ تعالیٰ کے ناموں اور صفات میں الحاد (کج روی) کی جملہ صورتیں ذیل کے سطور میں بیان کی جاتی ہیں۔

پہلی صورت: اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے کسی نام یا اس سے ثابت ہونے والی صفت کا انکار کرنا۔ جیسا کہ اہلِ جاہلیت اللہ تعالیٰ کے نام مبارک ''رحمٰن'' کا انکار کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے:



﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْجُدُوا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا﴾ (الفرقان:60)



''ان سے جب بھی کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو جواب دیتے ہیں رحمٰن ہے کیا؟ کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کا تو ہمیں حکم دے رہا ہے اور اس (تبلیغ) نے ان کی نفرت میں مزید اضافہ کر دیا''۔

یا جیسا کہ بعض مبتدعہ نے اللہ تعالیٰ کا نام تو تسلیم کیا لیکن اس نام پر مشتمل صفت کا انکار کر دیا جیسا کہ بعض باطل فرقے کہتے ہیں'' اللہ رحیم ہے بغیر رحمت کے اور سمیع ہے بلا سمع کے۔''

دوسری صورت: اللہ تعالیٰ کے ناموں میں اپنی طرف سے اضافے کر لینا، یعنی اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے نام گھڑ لینا جس کی اجازت اللہ تعالیٰ نے نہیں دی۔ یہ الحاد اس بنا پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسمائے عالیہ توقیفی (یعنی اللہ کی طرف سے متعین کردہ) ہیں۔ لہذا جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے متعین کردہ ناموں جو اس نے اپنے لئے منتخب کئے ہیں انہیں چھوڑ کر اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نام گھڑ لیتا ہے وہ اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہتا ہے جس کا اسے علم نہیں اور اللہ تعالیٰ نے ایسی بات کہنے سے منع فرمایا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:



﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَن تُشْرِكُوا بِاللهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (الاعراف:33)

''آپ فرما دیجیے کہ بیشک میرے رب نے حرام کیا ہے ان تمام فحش باتوں کو جو اعلانیہ ہیں اور

جو پوشیدہ ہیں اور ہر گناہ کی بات کو ناحق کسی پر ظلم کرنے کو اور اس بات کو کہ اللہ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی، اور اس بات کو کہ تم لوگ اللہ کے ذمے ایسی بات نہ لگادو جس کو تم جانتے نہیں۔"

جیسا کہ بعض لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو لفظ "خدا" اور لفظ (God) "گوڈ" یا فلاسفہ نے علہ الفاعلہ اور عیسائیوں نے "الاب" (والعیاذ باللہ) کا نام اللہ کیلئے متعین کیا ہے۔

تیسری صورت: اللہ تعالیٰ کے ناموں میں تبدیلی کر دینا جیسا کہ مشرکین نے کیا کہ اللہ کے ذاتی نام سے اپنے بت کا نام "لات" رکھ لیا اور اس کے صفاتی ناموں عزیز سے "عزیٰ" اور "المنان" سے "مناۃ" بنالیا۔

اس کے الحاد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رکھے ہوئے نام اسی کی ذات کیلئے خاص ہیں۔ لہذا انہی معنوں میں اللہ کے وہ نام مخلوق کیلئے استعمال کرنا کہ اس کی اللہ کے علاوہ عبادت کی جانے لگے۔ یہ الحاد (کج روی) ہے۔

فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿رَّبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ ۚ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا﴾ (مریم :65)

" آسمانوں کا، زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب وہی ہے تو اسی کی بندگی کر اور اس کی عبادت پر جم جا۔ کیا تیرے علم میں اس کا ہم نام ہم پلہ کوئی اور بھی ہے؟۔"

چوتھی صورت: اللہ تعالیٰ کے ناموں میں کمی کر دی جائے ۔مثلاً: اسے کسی ایک ہی مخصوص نام سے پکارا جائے اور دوسرے صفاتی ناموں سے پکارنے کو برا سمجھا جائے۔

پانچویں صورت: اللہ کے ناموں اور صفات میں الحاد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ان میں تاویل، تعطیل، یا تشبیہ سے کام لیا جائے۔

تاویل: اس طرح کہ جیسا کہ بعض مبتدعہ کہتے ہیں کہ "ید اللہ" سے مراد قوت ہے اور "استواء" کا مطلب غلبہ ہے۔ اللہ کو ہر جگہ ذات کے اعتبار سے حاضر سمجھتے ہیں۔ اور تعطیل سے مراد کلی انکار ہے۔ تشبیہ

سے مراد مخلوق کی صفات سے تشبیہ دینا۔ اور یہ کہتا ہے اللہ کا ساتھ مخلو کا ساتھ کی طرح ہے (والعیاذ باللہ)

چھٹی صورت: یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کے مذکورہ نام یا صفات ایسی ہی ہیں جیسا کہ مخلوق کی صفات۔

جیسا کہ بعض مبتدعہ نے یہ کہا کہ اللہ کا ہاتھ مخلوق کے ہاتھ کی طرح ہے۔ اس کا استواء ونزول مخلوق کے نزول واستواء کی طرح ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ساتویں صورت: اللہ تعالیٰ کی صفات میں پائے جانے والے معنیٰ ومفہوم کو مخلوق کیلئے بھی استعمال کرنا

اور یہ عقیدہ رکھنا کہ مخلوق بھی اس صفت کی مالک ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے معاشرے میں عام طور پر رائج ہے کہ لوگ اپنے پیروں اور بزرگوں کو ان صفات سے متصف کرتے ہیں جو ان معنیٰ میں محض اللہ تعالیٰ کیلئے استعمال ہوتی ہیں۔

مثلاً: جیسا پیر عبد القادر جیلانی کو غوث اعظم اور دست گیر کہا جاتا ہے۔ علی ہجویری کو داتا، گنج بخش کہا جاتا ہے، خواجہ معین الدین چشتی کو غریب نواز کہا جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

یہ تمام صفات اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں اب آیئے دیکھتے ہیں کہ ان القابات اور صفات کا جو غیر اللہ کیلئے استعمال کی گئی ہیں اور وہ حقیقۃً اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ ان کا معنیٰ ومفہوم کیا ہے؟

غوث اعظم سے مراد: مددگار، فریاد رسی کرنے والا

اب قرآن کریم کی روشنی میں ملاحظہ کریں کہ سب سے بڑا مددگار اور فریاد سننے والا کون ہے؟

فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿أَمَّن يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ﴾ (النمل:62)

”بھلا کون ہے جو لاچار کی فریاد رسی کرتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور اس کی تکلیف کو دور کر دیتا ہے اور (کون ہے جو) تمہیں زمین کے جانشین بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے؟ تم لوگ تھوڑا ہی غور کرتے ہو۔“

دست گیر: کا معنیٰ ہے مصیبت کے وقت مشکل کشائی کرنے والا

یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَّسَّهُ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾(یونس:12)

''اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں اپنے پہلو پر یا بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہر حالت میں پکارتا ہے پھر جب ہم اس سے وہ تکلیف دور کر دیتے ہیں تو ایسے گزر جاتا ہے جیسے اس نے تکلیف کے وقت ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔ایسے حد سے بڑھے ہوئے لوگوں کو وہی کام اچھے معلوم ہونے لگتے ہیں جو وہ کرتے ہیں۔''

داتا سے مراد: سب کچھ دینے والا

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿مَّا يَفْتَحِ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِن رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِن بَعْدِهِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾(فاطر:2)

'' اللہ اگر لوگوں کے لئے اپنی رحمت (کا دروازہ) کھول دے تو اسے کوئی بند کرنے والا نہیں اور جسے وہ بند کر دے تو اس کے بعد اسے کوئی کھولنے والا نہیں۔اور وہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے''۔

نیز ایک اور آیت میں فرمایا:

﴿لِّلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَن يَشَاءُ الذُّكُورَ ﴿٤٩﴾ أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَإِنَاثًا وَيَجْعَلُ مَن يَشَاءُ عَقِيمًا إِنَّهُ عَلِيمٌ قَدِيرٌ﴾
(الشوریٰ:49،50)

''آسمانوں کی اور زمین کی سلطنت اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے،وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے جسے چاہے بیٹے دیتا ہے۔یا انہیں جمع کر دیتا ہے بیٹے بھی اور بیٹیاں بھی اور جسے چاہے بانجھ کر دیتا ہے وہ بڑے علم والا اور کامل قدرت والا ہے۔''

گنج بخش: سے مراد خزانے بخشنے والا۔

یہ صفت بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے لیکن اسے مخلوق میں چند پیروں کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔

فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ﴾ (المنافقون:7)

”اور آسمان وزمین کے خزانے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں لیکن یہ منافق بے سمجھ ہیں“۔

نیز فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (آل عمران:37)

”بلاشبہ اللہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے۔“

غریب نواز سے مراد: غریبوں کو نوازنے والا۔

غریبوں کو نوازنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

فرمان باریٰ تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾ (فاطر : 15)

” لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور وہ (ہر چیز سے) بے نیاز اور حمد کے لائق ہے۔“

یعنی سب سے بڑا مدد کرنے والا، مشکل میں ہاتھ تھامنے والا، دینے والا، غریبوں کو نوازنے والا یہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات اور افعال ہیں۔ مخلوق کیلئے ان کا استعمال شرک بھی ہے اور الحاد بھی۔

اللہ تعالیٰ سب کو شرک سے محفوظ فرمائے اور اپنے اقوال افعال افکار و نظریات میں توحید اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اسلامی سزاؤں

میں رحمت الٰہی کے پہلو

خالد حسین گورایہ[1]

جزا و سزا کا تصور ہر معاشرے کا بنیادی حصہ ہے۔ دنیا میں کوئی بھی ایسا معاشرہ نہیں پایا جاتا جہاں سزا نہ ہو۔ کیونکہ جرم انسانی طبیعت کا خاصہ ہے، جہاں جرم ہو گا وہاں سزا ہو گی۔ ہر طبقے ہر معاشرے اور ہر قوم میں سزائیں موجود رہی ہیں کوئی معاشرہ ان سے خالی نہیں، البتہ ہر ایک کا سزا دینے کا طریقہ کار مختلف رہا ہے۔ انسان کی اسی فطری ضرورت کے پیش نظر اسلام دینِ رحمت میں جہاں گناہوں اور برائیوں سے روکنے کیلئے ترغیب و ترہیب کا انداز استعمال کیا گیا، وہیں کبائر الذنوب میں کچھ سزائیں بھی تجویز کی ہیں جن کا مقصد مجرم کو جرم سے روکنا، معاشرے کے دیگر افراد کو اس جیسے جرم میں مبتلا ہونے سے بچانا، اور اس جرم سے ہونے والے نقصان کی تلافی کرنا، مجرم کو اس کے کئے کی سزا دینا ہوتا ہے۔

لیکن ایک عرصہ سے یہ بات ہر عام و خاص کے ملاحظہ میں ہے کہ مغربی طبقہ بالعموم اور مسلم ممالک میں ان کی ہمنوا لابیاں اسلامی سزاؤں کو ہدف تنقید بناتی رہی ہیں اور اس چیز کو بطور خاص بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے کہ اسلامی سزاؤں میں بے رحمی ہے۔ بالخصوص ہاتھ کاٹنے اور سنگسار کرنے کی سزاؤں کو سخت اور معاذ اللہ وحشیانہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سابق صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کے دور میں جاری ہونے والا ''حدود آرڈیننس'' مسلسل مخالفت اور اعتراضات کا ہدف بنا ہوا ہے۔ بارہا اس کی متعدد دفعات کو وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کیا گیا اور اس کی منسوخی کیلئے قومی اسمبلی میں بل بھی لانے کی کاوشیں کی جا رہی ہیں۔ حدود بل کے مخالفین ایک تو وہ ہیں جو سرے سے ''حدود اللہ'' کے نفاذ کے سرا سر خلاف ہیں اور مغرب کی ہی حرف بحرف ترجمانی کرتے ہیں اور اسلامی سزاؤں کو ظالمانہ قرار دیتے ہیں۔ جبکہ ایک دوسرا طبقہ ان

[1] نائب مدیر المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

سزاؤں کے نفاذ کا تو قائل ہے لیکن اس کی تعبیر و تشریح اپنی من مانی سے کرتا ہے۔ انہی خود ساختہ شارحین میں جاوید احمد غامدی کا نام سرفہرست ہے۔ جو شراب کی حد کی بابت لکھتے ہیں:

"چناں چہ ہم پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی حد نہیں ہے، بلکہ محض تعزیر ہے، جسے مسلمانوں کا نظمِ اجتماعی (حکمران)، اگر چاہے تو برقرار رکھ سکتا ہے اور چاہے تو اپنے حالات کے لحاظ سے اس میں تغیر و تبدل کر سکتا ہے"۔ [1]

اسی طرح رجم کی سزا سے متعلق غامدی اور ان کے مشائخ فراہی و اصلاحی کا نظریہ یہ ہے کہ یہ شادی شدہ زانی کی سزا نہیں بلکہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں کی سزا 100 کوڑے ہی ہے۔ البتہ رجم کی سزا شرعی سزا نہیں یہ محض تعزیر ہے جو صرف اوباش قسم کے زانیوں کے لئے ہے اور وہ بھی حکمران کی صوابدید پر منحصر ہے۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ کریں حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ کی مایہ ناز تصنیف "فکر فراہی اور اس کے گمراہ کن اثرات ایک علمی و تحقیقی جائزہ"، صفحہ 266، 267، و مابعد)

چنانچہ جاوید احمد غامدی نے سورہ النساء کی آیت میں بیان کردہ عبوری سزائے زنا اور پھر حدیث: "خذوا عني ..." میں بیان کردہ مستقل سزا کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا: "ان ہدایات سے واضح ہے کہ ان کا تعلق عبوری دور سے تھا۔ چناں چہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی زیرِ بحث روایت "خذوا عني ..." کا مدعا در حقیقت یہی ہے کہ بعد میں نبی اکرم ﷺ کو وحی خفی کے ذریعے سے ہدایت کی گئی کہ یہ چوں کہ زنا ہی کے مجرم نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ اپنی آوارہ منشی، بدمعاشی اور جنسی بے راہ روی کی وجہ سے فساد فی الارض کے مجرم بھی ہیں، اس لیے ان میں سے ایسے مجرموں کو جو اپنے حالات کی نوعیت کے لحاظ سے رعایت کے مستحق ہیں، زنا کے جرم میں نور کی آیت 2 کے تحت سو کوڑے اور معاشرے کو ان کے شر و فساد سے بچانے کے لیے ان کی اوباشی کی پاداش میں مائدہ کی آیت کے تحت نفی، یعنی جلاوطنی کی سزا دی جائے اور ان میں وہ مجرم جنھیں کوئی رعایت دینا ممکن نہیں ہے، مائدہ کی اسی آیت کے تحت رجم کر دیے جائیں"۔ [2]

[1] برہان، ص: 138، 139 طبع پنجم بحوالہ فکر فراہی اور اس کے گمراہ کن اثرات از حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ

[2] برہان: ص 126، بحوالہ فکر فراہی اور اس کے گمراہ کن اثرات از حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ

حد شراب کی بے سروپا تاویل اور حد رجم کا سرے سے انکار اور اسے محض اوباشوں کے لئے مخصوص کرنے کا مقصد یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح حد خمر اور رجم سے جان چھڑائی جائے حالاں کہ روایاتِ رجم تقریباً تین درجن صحابہ سے مروی ہیں۔۔۔

تغافل سے جو باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

سابق الذکر طریقہ بھی اسلامی سزاؤں سے جان چھڑانے کیلئے دریافت کیا گیا آسان سا طریقہ ہے۔ اسلامی سزاؤں پر اہل باطل و مغربی فکر سے متاثرہ لوگ جو بنیادی اعتراض کرتے ہیں وہ یہی کہ یہ ظالمانہ، غیر منصفانہ، اور غیر انسانی سزائیں ہیں۔ (والعیاذ باللہ)

حالانکہ اگر اسلامی سزاؤں کو تعصب اور دین دشمنی کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلامی سزائیں عین عدل اور جرم کی بیخ کنی کیلئے سب سے موزوں سزائیں ہیں۔ بلکہ ان سزاؤں میں بنی نوع انسانی پر خصوصی رحمت و شفقت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ زیر نظر مضمون اسی رحمت کے بیان پر مشتمل ہے جس میں اسلامی سزاؤں میں پنہاں رحمت باری تعالیٰ کو نمایاں کیا گیا ہے اور دلائل و براہین سے واضح کیا گیا ہے کہ اسلامی سزائیں ظلم نہیں بلکہ عین عدل و رحمت ہیں، غیر انسانی نہیں بلکہ عین انسانی ہیں اور دنیا کے کسی بھی معاشرے میں ان سزاؤں کو نافذ کیے بغیر نہ امن آسکتا ہے نہ جرم ختم ہو سکتا ہے۔ نیز اسلام نے جو سزائیں مقرر کی ہیں ان میں بھی مجرم کے ساتھ رحمت کا برتاؤ کیا ہے نہ کہ غیر انسانی برتاؤ۔

اسلامی سزاؤں میں رحمت کے پہلو

اللہ تعالیٰ اور رسولِ نبی کریم ﷺ پر ایمان رکھنے والے ہر شخص کیلئے یہ عقیدہ رکھنا لازمی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے ہر طریقے اور ہر فرمان میں زندگی اور سعادت ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ﴾ (الأنفال: 24)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کے کہنے کو بجالاؤ، جب کہ رسول تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف بلاتے ہوں اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ آدمی کے اور اس کے دل کے درمیان آڑ بن جایا کرتا ہے اور بلاشبہ تم سب کو اللہ ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔''

رب اللعالمین کی شریعت کے ذریعے ہی مسلمان پر امن، پر اطمینان اور خوش حال زندگی گزار سکتا ہے، اور اسی شریعت کی بنا پر اللہ تعالی دنیا و آخرت کی بلائیں بھی ٹالتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سزائیں معاشرے کیلئے خیرات و برکات کا باعث بنتی ہیں اس کے برعکس اگر اسلامی سزائیں نافذ نہ کی جائیں تو وبال ہی وبال ہے۔

اب آیئے ذرا جائزہ لیتے ہیں کہ ان حدود کو مقرر فرما کر اللہ تعالیٰ نے اہلِ ارض پر کتنا بڑا احسان فرمایا۔

اسلامی سزاؤں کا نفاذ معاشرے اور جرم کرنے والے فرد دونوں کے لئے رحمت ہے

کیونکہ ان سزاؤں کے نفاذ سے قدرتی بلائیں ٹال دی جاتی ہیں جس کے بدلے میں انسان اپنے گناہوں کے وبال اور تباہ کن حادثات سے محفوظ رہتا ہے۔ اگر ان سزاؤں کا نفاذ نہ ہو تو انسان کو تقدیری فیصلوں کے مطابق سزا بھی ملے گی اور گناہوں کا حساب بھی دینا پڑے گا۔ چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿لَيۡسَ بِأَمَانِيِّكُمۡ وَلَآ أَمَانِيِّ أَهۡلِ ٱلۡكِتَٰبِۗ مَن يَعۡمَلۡ سُوٓءٗا يُجۡزَ بِهِۦ وَلَا يَجِدۡ لَهُۥ مِن دُونِ ٱللَّهِ وَلِيّٗا وَلَا نَصِيرٗا﴾ (النساء: 123)

''(جنت میں داخلہ) تمہاری خواہشات یا اہل کتاب کی خواہشات پر (منحصر) نہیں ہے، برا عمل کرنے والے کو اس کا بدلہ دیا جائے گا، اور اسے اللہ کے مقابلے میں کوئی دوست اور مدد گار نہیں ملے گا۔''

اس لئے رسولِ نبی کریم ﷺ نے جب واقعہ لعان میں میاں بیوی کو بلوایا تو دونوں کو یہی کہا کہ

''أن عذاب الدنيا أهون من عذاب الآخرة ''[1]

''دنیا کی سزا آخرت کی سزا کے مقابلے میں بہت ہلکی ہے۔''

[1] سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة باب فى للعان، حديث :2256

اس سے واضح ہوا کہ یہ سزا مجرم کے لئے بھی رحمت ہے کہ اسے آخرت کی سخت ترین سزا سے بچا کر دنیا میں ہلکی سزا دے کر کفارہ بنا دیا گیا۔

اور معاشرے کیلئے جرم کی افزائش کو جڑ سے ختم کر دیا گیا، قبل اس کے کہ یہ معاشرے کا ایسا ناسور بن جائے کہ بعد میں قابو کرنا محال ہو۔



شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

"الواجب دفع أعظم الضررين باحتمال أدناهما قبل استحكام الداء الذي ترامى به إلى الهلاك والعطب ومن المعلوم أن ألم العلاج النافع أيسر وأخف من ألم المرض الباقي"





" واجبی امر یہ ہے کہ چھوٹے نقصان کو برداشت کر کے بڑے نقصان سے بچا جائے، قبل اس کے کہ بیماری اپنی جڑیں مضبوط کرے جس کا نتیجہ تباہی اور ہلاکت کے سوا کچھ نہ ہو۔ اور بداہتہً یہ بات مسلّم اور معلوم ہے کہ بیماری کی دائمی تکلیف سے نفع بخش علاج کی تکلیف ہلکی اور قابل برداشت ہوتی ہے"۔



یہ ایک حقیقت ہے کہ گناہوں کی قدرتی سزا شرعی سزا سے کہیں بڑھ کر اذیت ناک اور المناک ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:



﴿وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ﴾ (ہود: 102)

"اور جب بھی آپ کا پروردگار ظلم کرنے والی بستیوں کو پکڑتا ہے تو اس کی گرفت ایسی ہی ہوتی ہے بلاشبہ اس کی گرفت دردناک اور سخت ہے۔"

اسی طرح فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ﴾ (البروج: 12)

"بیشک تیرے رب کی پکڑ بہت سخت ہے۔"

ایک حدیث میں ہے:

سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "إن

اللہ لیملي للظالم حتی إذا أخذہ لم یفلتہ''، قال: ثم قرأ: ﴿وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۚ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ﴾ (ہود: 102)[1]

''بیشک اللہ تعالی ظالم کو ڈھیل دیتا رہتا ہے، پھر جب پکڑتا ہے تو اسے مہلت نہیں دیتا'' پھر آپ (ﷺ) نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۚ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ﴾

اللہ کی حدود کا قیام رزق میں برکت اور فراوانی کا باعث ہے

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''حَدٌّ يُعْمَلُ بِهِ فِي الْأَرْضِ خَيْرٌ لِأَهْلِ الْأَرْضِ مِنْ أَنْ يُمْطَرُوا أَرْبَعِينَ صَبَاحًا''[2]

'' اللہ کی زمین پر اللہ کی حد کو نافذ کرنا چالیس دن کی بارش برسنے سے بہتر ہے'' یعنی اتنی خوشحالی چالیس روز کی بارش برسنے سے نہیں آتی جتنی کہ ایک حد کے قیام سے آتی ہے۔

فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم ۚ مِّنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ﴾ (المائدۃ:66)

''اور اگر یہ لوگ تورات وانجیل اور ان کی جانب جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمایا گیا ہے،ان کے پورے پابند رہتے تو یہ لوگ اپنے اوپر سے اور نیچے سے روزیاں پاتے اور کھاتے، ایک جماعت تو ان میں سے درمیانہ روش کی ہے،باقی ان میں سے بہت سے لوگوں کے برے اعمال ہیں۔''

---

[1] صحیح البخاری: حدیث:4686،صحیح مسلم: حدیث:2583،سنن النسائی:4904،ابن ماجہ:2538

[2] صحیح الجامع:3130،حسنہ الألباني

حدود اللہ کے قیام سے لوگوں کے جان ومال کا تحفظ ہوتا ہے۔

اسی حکمت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قصاص سے متعلق فرمایا:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (البقرۃ: 179)

”عقلمندو! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے اس کے باعث تم (قتل ناحق سے) رکو گے“

نفاذِ سزا کے مراحل میں مجرم کے ساتھ رحمت ونرمی کے اختیار کردہ پہلو

دین اسلام نے جن گناہوں پر سزائیں متعین کی ہیں ان کا مقصد انسانیت کی تذلیل اور اس کے ساتھ زیادتی نہیں بلکہ اس کی حفاظت اور بھلائی مقصود ہے نہ کہ محض ایذا۔ اس لئے بہت سے مواقع پر اسلام نے مجرم کی ذہنی وجسمانی حالت دیکھتے ہوئے سزاؤں میں نرمی بھی کی ہے۔ جس کے چند ایک نمونے قارئین یہاں ملاحظہ فرمائیں۔

بیمار اور کمزور پر نفاذ سزا میں نرمی

اگر بیمار ایسی حالت میں ہے کہ وہ شرعی حد کوڑوں کی سزا کا مستحق ہو چکا ہے لیکن اس کی بیماری اور علالت کی کیفیت ایسی ہے کہ وہ شفایاب نہیں ہوسکتا یا بشری تقاضوں کے مطابق انتہائی کمزور اور شدید بڑھاپے کی حالت میں ہے تو شریعت نے کوڑوں کی سزا میں اس کیلئے مزید آسانی فرما دی کہ اسے کوڑوں کے بجائے درخت کی شاخوں سے مارنے کا حکم دیا۔

چنانچہ سعید بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”كانَ بينَ أبياتِنا رجلٌ مُخدَجٌ ضَعيفٌ، فلَم يُرَعْ إلَّا وَهوَ على أمةٍ من إماءِ الدَّارِ يخبُثُ بِها فرفعَ شأنَهُ سعدُ بنُ عُبادةَ إلى رسولِ اللَّهِ صلَّى اللَّهُ علَيهِ وسلَّمَ فقالَ: اجلِدوهُ ضَربَ مائةِ سوطٍ قالوا: يا نبيَّ اللَّهِ هوَ أضعَفُ من ذلِكَ، لو ضرَبناهُ مائةَ سوطٍ ماتَ، قالَ فخُذوا لَهُ عِثكالًا فيهِ مائةُ شِمراخ

فاضرِبوهُ ضَربةً واحدةً" [1]

ترجمہ: "ہمارے گھروں کے درمیان ایک اپاہج و ناتواں رہتا تھا اس نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا جب وہ گھر کی لونڈیوں میں سے ایک لونڈی کے ساتھ منہ کالا کرتا پکڑا گیا۔ سید نا سعد بن عبادہ نے اس کا معاملہ اللہ کے رسول (ﷺ) کی خدمت میں رکھا آپ نے فرمایا اس کو سو کوڑے مارو لوگوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ) وہ ناتواں ہے یہ سزا برداشت نہیں کرسکتا اگر ہم اسے سو کوڑے ماریں گے تو وہ مرجائے گا فرمایا ایک خوشہ لو جس میں سو شاخیں ہوں اور ایک ہی دفعہ اس کو مارو"۔

عن رجل من الانصار :

"أنَّهُ اشتَكَى رجلٌ منهم حتَّى أُضْنِيَ، فعادَ جلدةً على عظمٍ، فدخلت عليهِ جاريةٌ لبعضِهِم فَهَشَّ لَها فوقعَ عليها، فلمَّا دخلَ عليهِ رجالُ قومِهِ يعودونَهُ أخبرَهُم بذلِكَ، وقالَ: استفتوا لي رسولَ اللَّهِ صلَّى اللَّهُ عليهِ وسلَّمَ، فإنِّي قد وقعتُ على جاريةٍ دخَلت عليَّ، فذَكَروا ذلِكَ لرسولِ اللَّهِ صلَّى اللَّهُ عليهِ وسلَّمَ وقالوا: ما رأينا بأحدٍ منَ النَّاسِ منَ الضُّرِّ مثلَ الَّذي هوَ بِهِ، لو حملناهُ إليكَ لتفسَّخت عظامُهُ، ما هوَ إلَّا جلدٌ على عظمٍ، فأمرَ رسولُ اللَّهِ صلَّى اللَّهُ عليهِ وسلَّمَ أن يأخذوا لَهُ مائةَ شمراخٍ فيضربوهُ بِها ضربةً واحدةً" [2]

ترجمہ: "ابوامامہ بن سہل (رضی اللہ عنہ) بن حنیف سے روایت ہے کہ انہیں رسول اللہ (ﷺ) کے بعض انصاری صحابہ نے بتلایا کہ ان میں سے ایک آدمی بیمار ہوگیا یہاں تک کہ کمزوری سے اس کے اوپر سے گوشت ختم ہوگیا اور اس کی ہڈی پر صرف کھال رہ گئی اس حالت میں ایک لونڈی اس کے پاس گئی تو اس کو دیکھ کر اس کو خواہش ہوئی اور اس نے اس لونڈی سے جماع کرلیا پس جب اس کی قوم کے افراد اس کی عیادت کے لئے گئے تو اس نے انہیں اس کے بارے میں بتلایا اور

[1] صحيح سنن ابن ماجه،كتاب الحدود،باب البكير والمريض۔۔۔ حديث 2574

[2] صحيح سنن أبي داؤد،اول كتاب الحدود باب فى اقامة الحد،حديث:4472

کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے میرے لئے فتوی پوچھو اس کے متعلق۔ان لوگوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس کا ذکر کیا اور کہا کہ ہم نے لوگوں میں سے کسی کو اتنا کمزور نہیں دیکھا اس شخص کی طرح جو اس کے اوپر کمزوری ہے اگر ہم اس کو آپ کے پاس اٹھا کر لائیں تو اس کی ہڈی الگ الگ ہو جائے اور اس کی ہڈیوں پر کھال کے علاوہ کچھ نہیں پس رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حکم دیا کہ اس کے لئے سوٹہنیاں لے کر ان سب سے اسے مارا جائے ایک مرتبہ"۔

حمل، حالتِ نفاس اور دودھ پلانے والی عورت پر حد کے نفاذ کو موخر کر دیا گیا

غامدیہ اور ماعز اسلمی سے سرزد ہونے والے زنا کے واقعے میں جب غامدیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ وہ امید سے ہیں آپ نے انہیں واپس بھیج دیا چنانچہ حدیث میں ہے وہ کہنے لگیں:

"فَوَاللَّهِ إِنِّي لَحُبْلَى، قالَ: إمَّا لا فَاذْهَبِي حتَّى تَلِدِي، فَلَمَّا وَلَدَتْ أَتَتْهُ بالصَّبِيِّ في خِرْقَةٍ، قالَتْ: هذا قدْ وَلَدْتُهُ، قالَ: اذْهَبِي فأرْضِعِيهِ حتَّى تَفْطِمِيهِ، فَلَمَّا فَطَمَتْهُ أَتَتْهُ بالصَّبِيِّ في يَدِهِ كِسْرَةُ خُبْزٍ، فَقالَتْ: هذا يا نَبِيَّ اللهِ ---- قدْ فَطَمْتُهُ، وَقَدْ أَكَلَ الطَّعَامَ، فَدَفَعَ الصَّبِيَّ إلى رَجُلٍ مِنَ المُسْلِمِينَ، ثُمَّ أَمَرَ بهَا فَحُفِرَ لَهَا إلى صَدْرِهَا، وَأَمَرَ النَّاسَ فَرَجَمُوهَا، فيُقْبِلُ خَالِدُ بنُ الوَلِيدِ بحَجَرٍ، فَرَمَى رَأْسَهَا فَتَنَضَّحَ الدَّمُ علَى وَجْهِ خَالِدٍ فَسَبَّهَا، فَسَمِعَ نَبِيُّ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عليه وسلَّمَ سَبَّهُ إيَّاهَا، فَقالَ: مَهْلًا يا خَالِدُ، فَوَالَّذِي نَفْسِي بيَدِهِ لقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً لو تَابَهَا صَاحِبُ مَكْسٍ لَغُفِرَ له. ثُمَّ أَمَرَ بهَا فَصَلَّى عَلَيْهَا، وَدُفِنَتْ".[1]

ترجمہ:" اور درانحالیکہ (میں) وہ عورت (ہوں جو) زنا کے ذریعے حاملہ ہے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا اچھا تو اس وقت تک انتظار کر جب تک تو اپنے بچے کی ولادت سے فارغ نہ ہو جائے۔ پھر جب وہ ولادت سے فارغ ہو گئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہتی ہیں کہ میں ولادت سے فارغ ہو گئی ہوں۔آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سے فرمایا جا اس بچے کو دودھ

[1] صحیح مسلم ،کتاب الحدود،باب من اعترف علی----حدیث: 1695

پلاتا آنکہ تو اس کا دودھ چھڑائے اور پھر جب اس نے بچے کا دودھ بھی چھڑا دیا تو اس بچے کو آنحضرت (ﷺ) کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئی اس وقت اس کے بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا، اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے اس بچے کا دودھ چھڑا دیا ہے یہ اب روٹی کھانے لگا ہے! آنحضرت (ﷺ) نے اس بچے کو ایک مسلمان کے حوالے کیا اور اس عورت کے لئے حکم فرمایا کہ ایک گڑھا کھودا جائے جو اس کے سینہ تک کھودا جائے جب اس کے سینہ تک گڑھا کھود دیا گیا تو آپ (ﷺ) نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا اور اس کو سنگسار کیا گیا اس کی سنگساری کے دوران جب سیدنا خالد بن ولید نے ایک پتھر اس کے سر پر مارا اور اس کے سر کا خون سیدنا خالد کے منہ پر آ کر پڑا تو سیدنا خالد اس کو برا بھلا کہنے لگے، رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا کہ خالد! ٹھہرو، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر یہ توبہ (ناروا) ٹیکس لینے والا کرے تو اس کی بھی مغفرت و بخشش ہو جائے۔ اس کے بعد آنحضرت (ﷺ) نے لوگوں سے اس کی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم دیا چنانچہ نماز جنازہ پڑھی گئی اور وہ دفن کی گئیں۔"

✺ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں:

" يَا أَيُّهَا النَّاسُ، أَقِيمُوا على أَرِقَّائِكُمُ الحَدَّ، مَن أَحْصَنَ منهمْ، وَمَن لَمْ يُحْصِنْ، فإنَّ أَمَةً لِرَسولِ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عليه وسلَّمَ زَنَتْ، فأمَرَنِي أَنْ أَجْلِدَهَا، فَإِذَا هي حَديثُ عَهْدٍ بنِفَاسٍ، فَخَشِيتُ إنْ أَنَا جَلَدْتُهَا أَنْ أَقْتُلَهَا، فَذَكَرْتُ ذلكَ للنبيِّ صَلَّى اللَّهُ عليه وسلَّمَ، فَقالَ: أَحْسَنْتَ."۔ وفي رواية: اتْرُكْهَا حتَّى تَمَاثَلَ۔[1]

ترجمہ: " اے لوگو اپنے غلاموں پر حد قائم کرو خواہ وہ ان میں سے شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ کیونکہ رسول اللہ (ﷺ) کی ایک باندی نے زنا کیا آپ (ﷺ) نے مجھے حکم دیا کہ میں اسے کوڑے لگاؤں لیکن اس نے ابھی قریب ہی زمانہ میں بچہ جنا تھا۔ مجھے ڈر ہوا کہ اگر میں

[1] صحيح مسلم، كتاب الحدود، باب تأخير الحد، حديث: 1705

نے اسے کوڑے مارے تو میں اسے مار دوں گا۔ لہٰذا میں نے یہ بات نبی کریم (ﷺ) سے ذکر کی تو آپ (ﷺ) نے فرمایا تو نے اچھا کیا"۔ اور ایک روایت میں ہے کہ "اس کو چھوڑ دو یہاں تک کہ وہ تندرست ہو جائے"۔



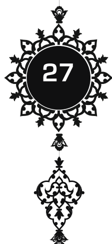
ہاں یہاں یہ خیال رہے کہ مجرم پر اگر تو کوئی ایسی سزا نافذ ہونی تھی جس میں موت ہو تو وہ لازماً نافذ ہو گی ہی کیونکہ اسی میں بہر کیف موت ہونی ہوتی ہے البتہ اگر کوئی خاتون حاملہ ہے تو اس سے چونکہ اس سزا کے بچے تک متعدی ہونے کے خطرات ہوتے ہیں اس لئے شریعت نے اس سے حد کو مؤخر کیا ہے۔

جنگی حالات میں سزا کے نفاذ کو مؤخر کر دیا گیا



نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لَا تُقْطَعُ الأَيْدِي فِي الغَزْوِ۔"[1]



امام ترمذی رحمہ اللہ اپنی سنن میں فرماتے ہیں:

"وَالْعَمَلُ عَلَى هَذَا عِنْدَ بَعْضِ أَهْلِ الْعِلْمِ مِنْهُمُ الْأَوْزَاعِيُّ، لَا يَرَوْنَ أَنْ يُقَامَ الْحَدُّ فِي الْغَزْوِ بِحَضْرَةِ الْعَدُوِّ، مَخَافَةَ أَنْ يَلْحَقَ مَنْ يُقَامُ عَلَيْهِ الْحَدُّ بِالْعَدُوِّ۔"

"اس روایت پر بعض اہل علم کا عمل ہے جن میں (امام) اوزاعی بھی ہیں، اس (امر) کے قائل ہیں کہ حالتِ جنگ میں جب دشمن سامنے ہو تو حد قائم نہیں کی جائے گی، اس ڈر سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس پر حد قائم کی گئی وہ کہیں دشمن سے نہ جا ملے۔"



سنن سعید بن منصور میں ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو لکھا کہ:

"لَا يَجْلِدَنَّ أَمِيرُ جَيْشٍ وَلَا سَرِيَّةٍ رَجُلًا مِنَ الْمُسْلِمِينَ حَدًّا وَهُوَ غَازٍ ، حَتَّى يَقْطَعَ الدَّرْبَ قَافِلًا، لِئَلَّا تَحْمِلَهُ حَمِيَّةُ الشَّيْطَانِ فَيَلْحَقَ بِالْكُفَّارِ۔"[2]

"کسی بھی لشکر یا جنگی مہم کے سربراہ کے لئے یہ روا نہیں کہ وہ حالتِ جنگ میں کسی مسلمان پر حد

[1] سنن الترمذي، كتاب الحدود، باب ماجاء أن لاتقطع الأيدى في الغزو، وصحح إسناده: الحافظ الذهبي، وابن حجر.

[2] سنن سعيد بن منصور، كتاب الجهاد، باب كراهة اقامة الحدود في أرض العدو

نافذ کرے، یہاں تک کہ وہ لشکر واپس نہ لوٹ آئے،اسلئے کہ کہیں یہ نہ ہو شیطانی حمیت اس شخص کو کفار سے ملنے پر مجبور نہ کر دے۔"

اور جیسا کہ "سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ابی محجن کو جب اس نے شراب پی تو محض قید کرنے پر ہی اکتفا کیا اور اس پر حد نافذ نہیں کی"۔ [1]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ "أعلام الموقعین" میں فرماتے ہیں:

"فَهَذَا حَدٌّ مِنْ حُدُودِ اللَّهِ تَعَالَى، وَقَدْ نَهَى عَنْ إقَامَتِهِ فِي الْغَزْوِ خَشْيَةَ أَنْ يَتَرَتَّبَ عَلَيْهِ مَا هُوَ أَبْغَضُ إلَى اللَّهِ مِنْ تَعْطِيلِهِ أَوْ تَأْخِيرِهِ، مِنْ لُحُوقِ صَاحِبِهِ بِالْمُشْرِكِينَ حَمِيَّةً وَغَضَبًا۔"

"یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود میں سے ایک حد ہے جس کا غزوہ کے دوران نفاذ سے منع کیا گیا ہے اس ڈر سے کہ اس کے نفاذ سے اللہ کے نزدیک زیادہ ناپسندیدہ چیز کا ظہور ممکن ہے جو کہ اس کی تعطیل یا تاخیر سے کہیں زیادہ ہے، کہ کہیں حد نافذ کردہ شخص غصے اور حمیت میں مشرکین سے ہی نہ جا ملے۔"

اب یہاں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کے اس قول کا جائزہ لیں کہ کیسے آپ احکامات کو اس کے نتائج اور مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے لاگو کرنے کے قائل ہیں، اور وہ اپنے فتاویٰ میں انہی چیزوں کو مدنظر رکھتے تھے ،لہذا یہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک مسلمان کا کافروں کی صف میں شامل ہو جانا یہ مفسدہ اس سے بڑھ کر ہے کہ حد کو وقتی طور پر معطل یا موقوف کر دیا جائے کیونکہ ایسا نہ کرنے سے اس سے برعکس نتیجہ برآمد ہو گا جو کہ زیادہ خطرناک ہے۔

غلام کی سزا کے میں نرمی

اسی طرح شریعت نے اس امر کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ اگر کوئی شخص غلام ہے تو سزا کی بابت اس پر نرمی کر دی گئی وہ چونکہ پہلے سے ہی تہی دست ہو کر زندگی گذار رہے ہوتے ہیں اسی امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام

[1] مصنف ابن أبي شيبة:33746، سنن سعيد بن منصور:2502

نے ان کے لیے کوڑوں کی سزا میں نرمی کر دی۔

''عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ أَرْسَلَنِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى أَمَةٍ لَهُ سَوْدَاءَ زَنَتْ لِأَجْلِدَهَا الْحَدَّ قَالَ فَوَجَدْتُهَا فِي دِمَائِهَا فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخْبَرْتُهُ بِذَلِكَ فَقَالَ لِي إِذَا تَعَالَتْ مِنْ نُفَاسِهَا فَاجْلِدْهَا خَمْسِينَ'' [1]



سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: ''نبی (ﷺ) نے مجھے اپنی ایک سیاہ فام خادمہ کی طرف بھیجا جس سے بدکاری کا گناہ سرزد ہو گیا تھا، نبی (ﷺ) نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، میں نے دیکھا کہ اس کا تو خون ہی بند نہیں ہو رہا، میں نے آ کر نبی (ﷺ) سے یہ بات ذکر کی، تو آپ نے فرمایا جب اس کا نفاس کا خون بند ہو جائے تو اسے پچاس کوڑے مارنا۔''





وضاحت: واضح رہے کہ اسلام میں آزاد شخص (غیر شادی شدہ) مرد ہو یا عورت اس کی سزا 100 کوڑے ہے لیکن یہاں پر ایک غلام خادمہ کے کمزور طبقے سے ہونے کے باعث اس پر سزا میں نرمی کی گئی اور سو کوڑوں کو پچاس میں تبدیل کر دیا گیا۔

قتل عمد میں بھی صرف قصاص ہی نہیں بلکہ دیت اور معافی کا اختیار بھی دیا گیا ہے۔



عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قتل عمد میں اسلام بہرصورت قاتل کو قصاصاً قتل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ لیکن یہ اسلامی قانونِ قصاص سے لاعلمی ہے بلکہ قتل عمد میں ورثاء کو قصاص کے ساتھ دیت لینے اور معاف کر دینے کا اختیار بھی دیا گیا ہے اور بلکہ معاف کرنے کو پسند کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ﴾ (البقرة 178)

ترجمہ: '' اے ایمان والو تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض کیا گیا ہے، آزاد، آزاد کے بدلے،

[1] مسند أحمد ،ج1، صفحه 136

غلام،غلام کے بدلے عورت،عورت کے بدلے ہاں جس کسی کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے اسے بھلائی کی اتباع کرنی چاہیے اور آسانی کے ساتھ دیت ادا کرنی چاہیے تمہارے رب کی طرف سے یہ تخفیف اور رحمت ہے۔"

اسی طرح قتل شبہ عمد اور قتل خطا میں محض دیت اور معافی کا اختیار دیا گیا ہے قصاص کا نہیں۔

نقصان کے متعدی ہونے کے پیش نظر قصاص کے بدلے دیت کا تعین

اس سے مراد یہ کہ اگر کسی شخص نے کسی دوسرے کو سر میں ضرب لگائی ہے جو دماغ کے قریب تک گئی ہے۔ اور قصاص نافذ کرتے وقت قاضی اگر محسوس کرتا ہے کہ اس مقام پر اگر قصاص کیلئے ضرب لگائی گئی تو خطرہ ہے کہ مجرم کے دماغ کو متاثر نہ کر دے تو ایسی حالت میں قصاص کے بجائے معاملہ دیت کی طرف لے جایا جائے گا۔ یا پھر کسی نے کسی کو پیٹ میں ضرب لگائی یا ہاتھ کی ہڈی کلائی وغیرہ سے توڑ دی تو اس میں اگر قاضی نے محسوس کیا کہ نفاذ قصاص کے وقت ظلم کا خدشہ ہو سکتا ہے تو وہ اسے موقوف کر کے دیت کا حکم دے گا۔

مجرم جرم کا اقرار کرنے کے بعد اپنے اقرار سے مکر جائے تو شریعت نے اس کا پیچھا کرنے کا حکم نہیں دیا

ماعز اسلمی کے قصے میں نفاذ حد کے وقت جب وہ فرار ہونے لگے تو صحابہ نے انہیں گھیر کر اونٹ کی ہڈی سر میں مار کر قتل کر دیا اور پھر ماجرا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ تو آپ فرمانے لگے "ھلا ترکتموہ"[1] تم نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا اور ایک روایت میں ہے " تم اسے چھوڑ دیتے اور میرے پاس لے آتے"۔

دین اسلام شبہ کی بنا پر حدود اللہ کے نفاذ سے منع کرتا ہے

رسول اللہ ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

"ادْرَئُوا الْحُدُودَ عَنْ الْمُسْلِمِينَ مَا اسْتَطَعْتُمْ فَإِنْ كَانَ لَهُ مَخْرَجٌ فَخَلُّوا سَبِيلَهُ

---

[1] سنن أبی داؤد،حدیث:4419

فَإِنَّ الْإِمَامَ أَنْ يُخْطِئَ فِي الْعَفْوِ خَيْرٌ مِنْ أَنْ يُخْطِئَ فِي الْعُقُوبَة"[1]

"جہاں تک ہو سکے مسلمانوں سے حدود کو دور کرو۔ اگر اس کے لئے کوئی راستہ ہو تو اس کا راستہ چھوڑ دو امام کا غلطی سے معاف کر دینا غلطی سے سزا دینے سے بہتر ہے"۔

آلہ سزا کے اختیار کرنے اور حد لگانے والے کیلئے ہدایات

اسلام میں جہاں سزاؤں کے تقرر میں، ثبوتِ جرم کے طرق و قرائن میں عمومی طور پر رحمت کے پہلو کو مدنظر رکھا گیا ہے اسی طرح حدود کو نافذ کرتے وقت بھی کئی ایسے پہلو ملحوظ رکھے ہیں جن میں سزا پانے والے کیلئے دوران نفاذ سزا اور اس کی کیفیت میں بھی رحمت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

جس میں حد نافذ کرنے والے کیلئے تقرر کیا گیا ہے کہ وہ متوسط طبیعت کا مالک ہو نہ انتہائی زیادہ طاقتور اور نہ زیادہ کمزور اس کے ساتھ جس چھڑی سے مارنا ہوتا ہے وہ بھی متوسط درجے کی ہو اور ساتھ یہ تلقین کی گئی کہ مارتے وقت جلاد اپنے بازو کو اتنا اوپر نہ اٹھائے کہ اس کے بغل ظاہر ہو جائیں بلکہ تھوڑا سا ہاتھ بلند کر کے مارے کیونکہ پوری قوت سے ہاتھ بلند کرنے کے باعث ضرب بہت شدت سے پڑتی ہے جبکہ شریعت کا مطلوب یہ نہیں بلکہ محض تادیب اور سزا کا نفاذ ہے نہ کہ کسی کو ہلاک کرنا۔

سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک ایسے شخص کو لایا گیا جس پر حد واجب ہو چکی تھی۔ انہیں چھڑی لا کر دی گئی تو آپ نے فرمایا: "اس سے کچھ نرم لیکر آؤ" لہٰذا آپ کو ایک انتہائی نرم چھڑی لا کر دی گئی آپ نے فرمایا "اس سے تھوڑی سی سخت ہو۔ لہذا انہیں ان دونوں چھڑیوں کے درمیان کی چھڑی لا کر دی گئی آپ نے فرمایا: "اب مارو اور تمہاری بغلیں نظر نہیں آنی چاہئیں، اور ہر ذی حق کو اس کا حق دو"[2]

محترم اور جسم کی نازک جگہوں پر مارنے سے بھی منع کیا گیا بلکہ مارتے وقت جسم کے ہر عضو پر تھوڑا تھوڑا مارنے کا کہا گیا نہ کہ ایک ہی جگہ مارتا رہے جس سے چمڑی ادھڑنے کا خدشہ ہو۔ اس حوالے سے دو

[1] اس روایت کی سند میں اگرچہ کلام ہے لیکن دیگر روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ وقد ذكر المباركفوري في شرح الترمذي: ما في الباب وإن كان فيه المقال المعروف فإنه يصلح للاحتجاج به على مشروعية درء الحدود بالشبهات المحتملة لا مطلق الشبهات.

[2] مصنف ابن ابی شیبہ ، کتاب الحدود ، باب ماجاء فی الضرب فی الحد

روایات پیش خدمت ہیں۔

1 رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے اگر کوئی مارے تو وہ چہرے کو بچا کر رکھے۔“[1]
اس روایت سے اہل علم نے استدلال کیا ہے کہ حدود میں یا غیر حدود میں چہرے پر مارنا جائز نہیں۔

2 سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک نشہ میں مدہوش شخص کو لایا گیا یا جن پر حد لازم ہو چکی تھی آپ فرمانے لگے: ” اسے ماریں، ہر عضو کو اس کا حق دیں اور چہرے اور شرمگاہ کو مارنے سے اجتناب کریں“۔[2]

حدود میں جس چھڑی سے مارا جاتا ہے اس کی صفات

اس حوالے سے موسوعۃ الفقہ الاسلامی میں بیان ہے کہ:

” يُضرب الرجل في الحد قائماً بسوط لا جديد ولا خَلِق، ولا يمد على الأرض، ولا يربط على جدار أو عامود، ولا يجرد من ثيابه، ويفرَّق الضرب على بدنه كالظهر والأليتين والفخذين والساقين، ولا يبالغ في الضرب بحيث يشق الجلد۔ ويتقي أثناء الجلد أربعة أشياء:الرأس.. والوجه.. والفرج.. والمقاتل.“[3]

”مرد پر حد نافذ کرتے وقت اسے کھڑے کر کے حد نافذ کی جائے گی اور ایسی چھڑی سے مارا جائے گا جو نہ تو بالکل تازہ اور نئی ہو اور نہ ہی بالکل بوسیدہ اور پرانی، اس طرح اسے زمین پر اوندھے منہ نہیں لٹایا جائے گا، نہ ہی اسے کسی دیوار یا ستون کے ساتھ باندھا جائے گا، نہ بے لباس کیا جائے گا، اور مارتے وقت جسم کی مختلف جگہوں پر مارا جائے گا کبھی کمر پر کبھی کولھوں پر، کبھی گھٹنوں پر اور کبھی پنڈلیوں پر، اسی طرح مارتے وقت بہت شدت سے نہیں مارا جائے گا کہ

[1] سنن أبي داؤد، حديث: 4444

[2] نصب الراية فى تخريج احاديث الهداية، كتاب الحدود

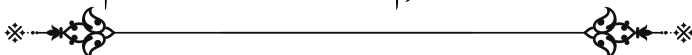
[3] موسوعة الفقه الإسلامي مؤلف محمد بن إبراهيم بن عبد الله التويجري جلد5/109،

چمڑی ادھڑ جائے۔ کوڑے لگاتے وقت چار مقامات سے پرہیز کیا جائے گا: سر، چہرہ، شرمگاہ، اور جسم کی دیگر کمزور جگہیں (جن پر ضرب پڑنے سے شدید نقصان یا پھر ہلاکت کا خدشہ ہو) اور عورت کے حوالے سے فرمایا:

"المرأة كالرجل في الجلد، إلا أنها تُضرب جالسة، وتشد عليها ثيابها، وتُمسَك يداها عند الحاجة؛ لئلا تنكشف".[1]

"عورت بھی کوڑے مارنے میں مرد کی طرح ہے البتہ اسے بیٹھے بیٹھے مارے جائیں گے اور اس پر اس کے کپڑے باندھ دیے جائیں گے اور اگر اس کے ہاتھ پکڑنے پڑے تو پکڑے جائیں گے تاکہ وہ بے پردہ نہ ہو۔"

حد نافذ کردہ مجرم کے اخلاقی تحفظ کا اہتمام



شریعت اسلامیہ نے محض مجرموں پر سزاؤں کے نفاذ سے قبل یا دوران ہی رحمت و شفقت کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ سزا کے نفاذ کے بعد لوگوں کی جانب سے جس طعن و تشنیع کا خطرہ رہتا ہے اسلام نے اس کے بھی راستے بند کئے ہیں کہ مذکورہ مجرم اپنے کئے کی دنیاوی سزا پا چکا اب مزید اسے ٹرول کر کے اس کے جذبات بھڑکا کر اسے ذہنی اذیت نہ دی جائے۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

" أنَّ رَجُلًا علَى عَهْدِ النبيِّ صَلَّى اللهُ عليه وسلَّمَ كانَ اسْمُهُ عَبْدَ اللَّهِ، وكانَ يُلَقَّبُ حِمَارًا، وكانَ يُضْحِكُ رَسولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عليه وسلَّمَ، وكانَ النبيُّ صَلَّى اللهُ عليه وسلَّمَ قدْ جَلَدَهُ في الشَّرَابِ، فَأُتِيَ به يَوْمًا فأمَرَ به فَجُلِدَ، فَقالَ رَجُلٌ مِنَ القَوْمِ: اللَّهُمَّ العنْه، ما أكْثَرَ ما يُؤْتَى بهِ؟ فَقالَ النبيُّ صَلَّى

---

[1] أيضا صفحه 110

اللّٰهُ عليه وسلَّمَ: لا تَلْعَنُوهُ، فَوَاللَّهِ ما عَلِمْت إنَّه يُحِبُّ اللَّهَ ورَسولَهُ۔"[1]

"سیدنا عمر بن الخطاب سے روایت کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ ایک شخص نبی (ﷺ) کے زمانے میں جس کا نام عبد اللہ اور لقب حمار تھا اور رسول اللہ (ﷺ) کو ہنسایا کرتا تھا اور نبی (ﷺ) نے اس کو شراب پینے کے سبب کوڑے لگوائے تھے ایک دن پھر نشہ کی حالت میں لایا گیا آپ نے اس کو کوڑے مارنے کا حکم دیا تو اس کو کوڑے لگائے گئے، قوم میں سے ایک شخص نے کہا کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو، کس قدر یہ (نشہ کی حالت میں) لایا جاتا ہے، نبی (ﷺ) نے فرمایا کہ اس پر لعنت نہ کرو، اللہ کی قسم میں جانتا ہوں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے"۔

"أُتِيَ النَّبيُّ صَلَّى اللهُ عليه وسلَّمَ برَجُلٍ قدْ شَرِبَ، قَالَ: اضْرِبُوهُ -قَالَ أبو هُرَيْرَةَ: فَمِنَّا الضَّارِبُ بيَدِهِ، والضَّارِبُ بنَعْلِهِ، والضَّارِبُ بثَوْبِهِ- فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ بَعْضُ القَوْمِ: أخْزَاكَ اللَّهُ! قَالَ: لا تَقُولوا هَكَذَا؛ لا تُعِينُوا عليه الشَّيْطَانَ."[2]

"سیدنا ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) روایت کرتے ہیں نبی (ﷺ) کے پاس ایک شخص لایا گیا جو شراب پیئے ہوئے تھا، آپ نے فرمایا کہ اس کو مارو، حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) کا بیان ہے کہ ہم میں سے بعض اس کو ہاتھ سے اور بعض اس کو جوتیوں سے اور کوئی اپنے کپڑوں سے مار رہا تھا، جب مار چکے تو کسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تجھے رسوا کرے، آپ نے فرمایا کہ اس طرح نہ کہو اور شیطان کی اس پر مدد نہ کرو۔"

کیا شرعی سزا کے علاوہ کوئی خود ساختہ سزا تجویز کر لی جائے تو یہ کفایت کرے گی؟

اسلام چونکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس نے زندگی گذارنے کے لئے ایک ایک پہلو سے متعلق اہل ایمان کی رہنمائی کی ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے جن اعمال کو گناہ قرار دیا ہے ان میں سے چند ایک گناہوں پر

[1] صحیح البخاری، حدیث: 6780

[2] صحیح سنن أبي داؤد، حدیث: 4477

دنیوی سزائیں متعین کی ہیں ان سزاؤں کو چھوڑ کر دوسری خود ساختہ سزائیں تجویز کر لینا اللہ تعالیٰ کے قانون سے روگردانی اور انحراف ہے جو کہ ایک بہت بڑا جرم ہے۔ کیونکہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ (الأعراف: 54)

ترجمہ: ''یاد رکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا بڑی خوبیوں سے بھرا ہوا اللہ جو تمام عالم کا پروردگار ہے''۔



جب خالق اللہ تعالیٰ ہے بادشاہت اس کی ہے تو نظام بھی اس زمین پر اسی کا لاگو ہو گا۔ یہ تو ایک ایمان کا بنیادی مسئلہ ہے جس پر ہر مسلمان کو پابند رہنا چاہئے۔



دوسرا امر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو سزائیں جن گناہوں پر مقرر فرمائی ہیں وہی سزاعین عدل ہے اس سے ہٹ کر جو بھی سزا اس جرم میں تجویز کی جائے گی اس میں ظلم ہو گا۔ اس میں محض مجرم کے ساتھ ظلم نہیں بلکہ معاشرے اور اس شخص سے متعلقہ افراد پر بھی اس ظلم کے اثرات مرتب ہوں گے اس کی مثال ذیل میں ایک مسئلہ سے سمجھیں۔



کیا زنا بالجبر کے مرتکب شخص کو نامرد بنایا جا سکتا ہے؟



یہ مسئلہ گذشتہ دنوں پاکستان میں زور و شور پر تھا ہمارے ملک کے وزیر اعظم نے اس کی تجویز دی بعد ازاں اس پر ایک آرڈیننس جاری کر دیا گیا۔ چنانچہ وفاقی وزیر قانون بیرسٹر فروغ نسیم نے کہا کہ ''زیادتی کے مجرموں کو نامزد کر کے ان کی کمیکل کاسٹریشن (نامرد بنایا جانا) کی جائے گی''۔ وزیر اعظم کی زیر صدارت وفاقی کابینہ نے بھی اینٹی ریپ آرڈیننس 2020ء کی منظوری دیدی۔



اور کہا جا رہا ہے کہ کئی ممالک میں جنسی مجرموں کو نامرد بنائے جانے کے قوانین موجود ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ کی تجویز کردہ اس سزا کے مقابلے میں جو سزا تجویز کی گئی ہے کیا یہ سزا مبنی بر عدل ہے؟! جب اس کا تجزیہ کیا جائے تو صورت حال واضح ہو جاتی ہے۔

یہاں ہم علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی شرعی سزاؤں کی حکمت اور ان کے مبنی بر عدل ہونے اور اگر اس کے علاوہ

کوئی سزا متعین کی جاتی ہے اس میں ظلم کے پہلو کے موجود ہونے کے حوالے سے تحریر قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں آپ فرماتے ہیں:" ایسی چیزیں یا اعمال جنہیں طبیعت فطرتاً ناپسند کرتی ہے اور طبائع میں اس کے کرنے کا کوئی ایسا داعیہ و محرک بھی نہیں ہوتا تو ایسے اعمال کے ارتکاب پر شریعت نے کوئی حد مقرر نہیں کی بلکہ اس کی حرمت بیان کر کے اور تعزیراتی سزا کی رہنمائی کر دی جیسا کہ گوبر کھانا، خون پینا، مردار کا گوشت کھانا وغیرہ۔ اور ایسے اعمال یا چیزیں جن کی انسانی فطرت و طبیعت میں طلب اور خواہش ہوتی شریعت نے ان امور کے ارتکاب پر اس عمل کی مفسدت اور نفس میں اس کے داعیے کو ملحوظ رکھتے ہوئے سزا متعین فرما دی ہے (جو کہ حدود شرعیہ کی شکل میں موجود ہے)۔

زنا کی طرف طبیعت کا میلان اور اس کی طلب بہت زیادہ ہے اسی بنا پر اس کی بڑی سے بڑی سزا سخت ترین اور عظیم ترین طریقے سے قتل کرنا مقرر کی گئی، اور اس کی آسان ترین سزا بھی کوڑوں کی شکل میں سخت ترین رکھی اس کے ساتھ اضافی طور پر ایک سال کے لیے جلاوطنی عام بھی مقرر کی گئی۔ اور لواطت میں چونکہ دو امور پائے جاتے ہیں اس لئے اس کی سزا بہر صورت قتل مقرر کر دی گئی۔ اور جب چوری کا طبیعت میں داعیہ و محرک بہت مضبوط تھا اور اسی طرح اس کا نقصان بھی کافی ہے، اس میں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا۔ اب آپ اس حکمت پر غور کریں جس کی بنا پر جس عضو نے گناہ کی مباشرت کی ہے اسے ہی معطل کر دیا گیا ہے، جیسا کہ حرابہ (دہشت گردی) کی حد میں قاطع طریق (غنڈہ گردی کرنے والے) کا ہاتھ اور پاؤں کاٹنے کا کہا گیا جو کہ اس کے گناہ کے آلات تھے۔ اور قذف کرنے والے شخص کی زبان کاٹنے کا حکم نہیں دیا گیا جس سے اس نے گناہ کیا ہے، کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو اس کے کاٹنے سے اس کے گناہ سے زیادہ اس کو سزا ملتی نہ کہ اس کے برابر، اس بنا پر اس کے تمام جسم کو کوڑوں سے تکلیف دینے کو ہی کافی جانا گیا۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ: زنا کرنے والے شخص کی شرمگاہ ہی کیوں نہ کاٹ دی جائے جس سے اس نے گناہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب کئی ایک پہلوؤں سے ہے۔ یعنی ایسا نہ کرنے کی کئی ایک وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ: شرمگاہ کو کو کاٹنے کا نقصان اس کے جرم سے بڑا نقصان ہے کیونکہ اس سے اس مجرم کی نسل کشی ہوتی ہے اور اس کے ہلاک ہونے کا بھی خدشہ ہوتا ہے۔

دوم: شرمگاہ ایک ڈھکی چھپی چیز ہوتی ہے اس کے کاٹنے سے حد کے نفاذ کا مقصد فوت ہو جاتا ہے کیونکہ حد کے نفاذ کا مقصد یہ ہے کہ اسے دیکھ کر دیگر لوگ عبرت پکڑیں اور اس طرح کے جرم کا ارادہ رکھنے والے لوگ باز (یعنی جو بھی اس کا ہاتھ کٹا دیکھے گا اس سے عبرت حاصل کرے گا) آئیں بخلاف ہاتھ کے۔

سوم: ہاتھ کاٹنے میں یہ ہوتا ہے اگر چوری کرنے والے کا ایک ہاتھ کاٹا گیا ہے تو اس کا دوسرا ہاتھ سلامت ہے جو کہ کٹنے والے ہاتھ کا بدل ہے (انسان اس ہاتھ سے اپنے کام سرانجام دے سکتا ہے) بخلاف شرمگاہ کے کہ اس کا کوئی بدل نہیں ہے۔(اگر اسے ختم کر دیا جائے تو یہ مجرم کے ساتھ اضافی زیادتی ہو گی جو کہ اس کی نسل کو متاثر کرے گی)

چہارم: زنا کی لذت انسان کا تمام جسم محسوس کرتا ہے،اس لئے بہتر تھا کہ سزا بھی پورے جسم کو ہی ملے، یہ اس سے بہتر ہے کہ اس کو کسی ایک عضو کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے۔

پس شارع کی تمام سزائیں ہر لحاظ سے کامل ومکمل ہیں، عقل کے بالکل موافق،اور مصلحت کے بالکل عین مطابق ہیں۔

اسلامی سزاؤں کے نفاذ کے فوائد

1. بشریت کو ظلم وزیادتی کرنے سے روکنا اور ایسے کاموں سے بچانا جو حدود کے نفاذ کا باعث بنتے ہیں۔
2. انسانی حرمت (چاہے وہ جسمانی ہو یا مالی یا اخلاقی) پامال کرنے والے شخص کو سزا دینا۔
3. معاشرے سے جرائم کا قلع قمع کرنا(جو کہ اسلامی سزاؤں کے نفاذ کے بغیر ممکن نہیں) بلکہ دیگر جتنی بھی سزائیں تجویز کی جاتی ہیں ان میں یا تو مجرم کے لئے بہت سے چور دروازے ہوتے ہیں بچ نکلنے کے یا پھر دوسرے فریق کی تشفی نہیں ہوتی۔
4. اسلامی سزاؤں میں دنیا سے جرم کے خاتمے کی تینوں صفات بدرجہ اتم موجود ہیں۔پہلی صفت سزا ایسی

ہو جو جرم کے واقع ہونے سے پہلے مانع ہو، اس کے واقع ہونے کے بعد زاجر ہو، اور اس کے نافذ ہونے سے مجرم جرم سے رک جائے، اور وہ دوبارہ اس میں ملوث نہ ہو۔ تو خلاصہ یہ ہوا کہ اسلامی سزائیں معاشرے کو سدھارنے کیلئے، نقصان کے مواقع و مفاسد کو ختم کرنے کیلئے ہیں۔ نہ کہ محض ایک مجرم کو اذیت دینے کے لیے۔



5 معاشرے کو فساد سے پاک کرنا۔

6 جرم کے دوبارہ سرزد ہونے سے بچانا۔

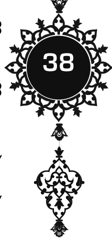
7 مجرم کی اصلاح و تہذیب نہ کہ تشدد و تعذیب۔



8 جرم کا قلع قمع اور فحاشی کی بیخ کنی۔

9 بدلے لینے کی آگ کو ٹھنڈا کرنا جو کہ جرم کے انتشار کا باعث بنتی ہے۔

10 معتدی علیہ اور اس کے رشتہ داروں کے حسد کی آگ کو ٹھنڈا کرنا۔

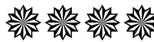


11 امن و امان کی بحالی اور تمام شعبہ ہائے زندگی میں اس کا حصول۔

یہ اسلامی سزاؤں میں رحمت کے چند ایک پہلو تھے جو کہ انتہائی اختصار سے بیان کیے گئے بات یہیں ختم نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر اور بھی کئی حکمتیں اور پہلو ہیں جو اسلامی سزاؤں میں جھلکتے ہیں جو اسلام کے نظامِ عدل، اور قرآن و حدیث میں اسلامی سزاؤں کی مصلحتوں اور تعلیمات پر غور کرنے سے پتہ چلتے ہیں۔



اللہ تعالیٰ اس دین کو ہمیں مکمل زندگی نافذ کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ انہ ولی التوفیق



کار انشورنس جائز یا ناجائز؟

عثمان صفدر حفظہ اللہ[1]

موجودہ دور میں جہاں تن آسانی اور سہولیات کی فراوانی ہے وہی کچھ چیزوں میں پریشانی اور نقصان کا اندیشہ بھی ہے۔ جیسے تجارت میں نئ جہتیں اور طور طریقے رائج ہو رہے ہیں تو وہیں مال یا سودے میں نقصان کے امکانات بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ تجارت میں نقصان کے اِس پہلو کے پیشِ نظر اِس میدان میں ایک اور جہت کا اضافہ ہوا جو موجودہ دور کی تجارت میں جزوی طور پر رائج ہو چکا ہے جسے ہم ضمانت (Insurance) کے نام سے جانتے ہیں۔

انشورنس کا مفہوم

عام طور پر جس طرح کے تجارتی معاملات میں ہمیں انشورنس کی ضرورت پیش آتی ہے اُس میں گڈز انشورنس، میڈیکل انشورنس، کار انشورنس اور لائف انشورنس شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی طرح کے معاملات میں انشورنس کی پالیسیاں آتی رہتی ہیں۔ انشورنس کیا ہے اور یہ کہ اسے فراہم کرنے والے ادارے کس طرح کام کرتے ہیں یہ سمجھنا بہت ضروری ہے۔

مثال کے طور پر صارف ایک گاڑی خریدتا ہے جس کی قیمت تیس لاکھ روپے ہے۔ اب چونکہ گاڑی قیمتی ہے تو کسی حادثے کی صورت میں نقصان بھی زیادہ ہوگا اسی خدشے کے پیشِ نظر صارف کسی انشورنس کمپنی سے کار کی انشورنس پالیسی لے لیتا ہے جس میں ہوتا یہ ہے کہ کمپنی گاڑی کی قمیت کے حساب سے ایک پالیسی بناتی ہے اور صارف کو دے دیتی ہے۔ گاڑی اگر تیس لاکھ کی ہے تو انشورنس دس لاکھ کی ہوگی جو کہیں دو سال تو کہیں پانچ سال تک کے لئے کار آمد ہوگی۔ اب یہ دس لاکھ کی رقم صارف کو طے شدہ مدت میں قسط وار دینی ہوگی۔ پھر خدانخواستہ اگر انشورنس کی مدت کے درمیان گاڑی کو کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے تو

[1] مدیر المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

صارف کے انشورنس کلیم کرنے پر کمپنی صارف کو دس لاکھ کی رقم ادا کرے گی چاہے صارف نے صرف چھ ماہ کی قسطیں ادا کی ہوں یا چار ماہ کی۔ کمپنی صارف کو پورے دس لاکھ دینے کی پابند ہوگی۔

اسی طرح گڈز انشورنس کا معاملہ ہے جس میں صارف بیرونِ ملک سے کوئی چیز منگواتا ہے تو نقصان سے بچنے کے لئے اُس سامان پر انشورنس حاصل کر لیتا ہے۔ بظاہر یہ سادہ سا معاملہ ہے جس میں کسی چیز کے نقصان کی پیشگی ضمانت حاصل کی گئی ہے۔ اب اگر ہم شریعت کے بیان کردہ اُصولوں پر اِس معاملے کا جائزہ لیں تو سمجھ آتا ہے کہ یہ معاملہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔





سب سے پہلے تو یہ بات واضح ہونی چاہیئے کہ شریعت میں تجارت پر کسی قسم کے نقصان سے بچنے کے لئے پیشگی احتیاطی تدابیر (risk management) اختیار کرنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ اللہ رب العالمین نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (البقرۃ: 195)



”اور (جان بوجھ کر) اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔“

قرآنِ کریم کی اِس آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احتیاطی تدابیر کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جبکہ انشورنس احتیاطی تدبیر والا معاملہ نہیں ہے اور علماء نے اِسے حرام قرار دیا ہے جس کی وجہ سُود ہے۔

انشورنس میں سود کا عنصر



کسی بھی تجارت میں اگر ہم جنس چیز کا سودا ہو رہا ہو تو اس میں قیمت ایک ہی ہونی چاہیے، اُس میں فرق نہیں ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر صارف نے کمپنی سے دس لاکھ روپے کی انشورنس لے لی اور قسطوں کی ادائیگی شروع ہوگئی، ابھی صارف نے صرف دو لاکھ روپے کی رقم ہی ادا کی تھی کہ صارف کسی حادثے کا شکار ہو گیا۔ اب صارف کی جانب سے حادثے میں ہونے والے نقصان کی تلافی کے لئے انشورنش کو کلیم کیا گیا۔ آسان اور مختصر الفاظ میں یوں سمجھ لیں کہ صارف نے انشورنس کی مد میں صرف دو لاکھ روپے ادا کئے تھے لیکن حادثے کی وجہ سے کلیم کرنے پر اُس نے دس لاکھ روپے کمپنی سے وصول کئے جو کہ سُود ہے، حرام ہے۔

انشورنس میں جُوّے کا عنصر

پھر سُود کے علاوہ اِس میں جُوّے کا عنصر بھی شامل ہے۔ اور جُوّے کے بارے میں ہم نے بتایا تھا کہ جب دو فریق کسی تجارتی معاہدے میں شامل ہوں اور اُن دونوں میں سے کوئی بھی یہ نہ جانتا ہو کہ وہ نقصان میں رہے گا یا فائدے میں تو یہ جُوّا کہلائے گا۔

کار انشورنس میں بھی جُوّا اِسی طرح ہوتا ہے کہ صارف اور انشورنس کمپنی کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے لیکن دونوں میں سے کوئی یہ نہیں جانتا کہ کون فائدے میں رہے گا اور کون نقصان میں۔ صارف اگر دس لاکھ روپے مکمل ادا کر دیتا ہے اور اُسے انشورنس کلیم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تو وہ نقصان میں رہا۔ اِس کے برعکس اگر وہ معاہدے کے ابتدائی ایام میں کسی حادثے کی وجہ سے انشورنس کلیم کرتا ہے تو کمپنی کو ایک یا دو لاکھ کے عوض میں دس لاکھ روپے ادا کرنے پڑے جس کی وجہ سے کمپنی نقصان میں رہی اور یوں یہ معاملہ جُوّے کی شکل اختیار کر گیا۔

یہاں کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ دل کے اطمینان کے لئے ہے تاکہ دلی طور پر وہ مطمئن ہوں کہ کسی حادثے اور نقصان کی صورت میں ان کے پاس کوئی متبادل حل ہے یا یہ کہ نقصان کے ازالے کی صورت ہے۔ کسی بھی معاملے میں تالیفِ قلبی اور دلی اطمینان حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ وہ معاملہ حرام کردہ چیزوں کا نہ ہو، اُس میں اللہ رب العالمین کی معین کردہ حدود سے تجاوز نہ ہو، رب کی نافرمانی نہ ہو اور شریعت کی خلاف ورزی نہ ہو۔ یعنی اگر کوئی یہ کہے کہ وہ اپنی جمع پونجی بینک میں اس لئے رکھوا رہا ہے تاکہ وہ محفوظ رہے اور ساتھ ساتھ اُسے ایک معقول منافع بھی ملتا رہے تو یہ جائز نہیں ہوگا کیونکہ یہ سُود ہے۔ اسی طرح کار انشورنس، گڈز انشورنس اور لائف انشورنس بھی سُود اور جُوّے کی وجہ سے حرام ہے جس سے شریعت نے ہمیں منع کیا ہے۔ البتہ میڈیکل انشورنس کا معاملہ دیگر انشورنس کے معاملات سے قدرے مختلف ہے جس میں جواز اور ممانعت دونوں طرح کی صورتیں موجود ہیں۔ جس کی تفصیل آئندہ کسی مضمون میں بیان کی جائے گی۔ ان شاء اللہ

اللہ رب العالمین سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو ناجائز اور حرام تجارت سے محفوظ فرمائے اور حلال تجارت کو اختیار کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

جدید انعامی اسکیموں اور آفرز کا شرعی حکم

عثمان صفدر حفظہ اللہ[1]

سپر اسٹورز کی انعامی اسکیموں کا حکم!

انعامی اسکیموں کی مختلف صورتوں کی وضاحت

آج کل ایک نیا رجحان پیدا ہوا ہے کہ لوگ خریداری کے لئے بڑے شاپنگ مالز یا اسٹورز میں جاتے ہیں جیسے "امتیاز سپر اسٹور" یا دیگر شاپنگ مالز۔ لوگوں کے اِس رجحان کو دیکھتے ہوئے کچھ کمپنیاں اپنی پروڈکٹ کی طرف صارف کو راغب کرنے کے لئے اُس پروڈکٹ کے ساتھ کوئی انعامی کوپن یا کوئی اور انعامی چیز منسلک کر دیتے ہیں۔ یہ طریقہ پہلے بھی استعمال ہوتا تھا اور محلے کی دکانوں پر بھی وہ کمپنیاں اپنی پروڈکٹ رکھواتی ہیں پر مالز یا اسٹورز میں اس کے لئے باقاعدہ اسٹال یا کاؤنٹر بنا دیئے جاتے ہیں۔ یا پھر شاپنگ مالز اور سپر اسٹورز خود اس طرح کی اسکیم متعارف کرواتے ہیں کہ اگر آپ پانچ ہزار یا دس ہزار روپے تک کی خریداری کرتے ہیں تو آپ کسی انعام (عمرے کا ٹکٹ یا گاڑی) کی قرعہ اندازی میں شامل ہو جائیں گے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شریعت کی نظر میں اِس کا کیا حکم ہے؟

مذکورہ انعامی اسکیموں میں موجود قباحتیں

پہلی قباحت:

سب سے پہلے تو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ شریعت میں ایک چیز کا ذکر ہے جسے عربی زبان میں "قمار" کہا جاتا ہے اور یہی لفظ اُردو زبان میں عام طور پر جوا کہلاتا ہے۔ جس میں دو فریق کسی طرح کے لین دین میں شامل ہوتے ہیں یا کسی ایسے معاہدے کا حصہ بنتے ہیں جس میں دونوں

[1] مدیر المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

پارٹیز کو یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ منافع میں کون رہے گا اور نقصان میں کون رہے گا پھر یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا انجام یا اختتام کیا ہو گا۔

یہ بنیادی طور پر جوئے کی ایک صورت ہے جس کے بارے میں علماء نے یہ کہا ہے کہ ''مستور العاقبۃ'' یعنی ایسی چیز جس کے انجام کا علم نہ ہو کہ کون منافع حاصل کرے گا اور کون نقصان اٹھائے گا۔

دوسری قباحت:

دوسری طرف سپر اسٹورز (Super Stores) جیسے امتیاز سپر اسٹورز کی طرف سے کوئی انعامی اسکیم متعارف ہوتی ہے اور اس میں شامل ہونے کے لئے ان کی طرف سے ایک شرط یہ ہوتی ہے کہ اگر آپ پانچ ہزار یا اس سے زائد رقم کی خریداری کرتے ہیں تو آپ اِس اسکیم کا حصہ بن سکتے ہیں۔ پھر جب صارف اُس شرط کو مکمل کر لیتا ہے تو اسٹور کی جانب سے اُس صارف کا انعام یقینی ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے اور آپ وہ مخصوص رقم خرچ کرنے کے بعد قرعہ اندازی میں شامل ہوتے ہیں تو آپ کو انعام کا ملنا یا نہ ملنا غیر یقینی ہوتا ہے جو کہ صراحتاً جوا ہے۔

مثال کے طور پر:

''ایوری ڈے'' (Every day) ایک پروڈکٹ ہے جو کہ خشک دودھ ہے اور چائے وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اب اگر کمپنی ایک پیکٹ کے ساتھ ایک چائے کا کپ انعام کے طور پر رکھ دیتی ہے تو یہ ایک یقینی انعام ہے۔ لیکن دوسری طرف اگر کمپنی کہتی ہے کہ اِس طرح کے پانچ یا دس پیکٹ خریدنے پر آپ ایک انعامی قرعہ اندازی میں شامل ہو جائیں گے۔ پھر صارف اس انعام کو حاصل کرنے کے لئے وہ پیکٹس خرید لیتا ہے تو یہ جوا ہو جائے گا۔ یا اسی طرح اگر ''یوفون'' یا ''جیز'' کی طرف سے صارف کے لئے یہ آفر آتی ہے کہ اگر وہ 200 روپے کا بیلنس تین دن میں استعمال کرے گا تو اسے عمرے کے ٹکٹ کی قرعہ اندازی میں شامل کر لیا جائے گا تو یہ طریقہ کار بھی جوا بن جائے گا۔ کیونکہ اس میں صارف کو انعام کا ملنا

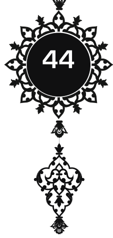
یا نہ ملنا غیر یقینی ہے۔
اس کے برعکس اگر ''Jazz'' کمپنی کہے کہ ہم اپنے تمام کسٹمرز کو عمرے کی قرعہ اندازی میں شامل کرتے ہیں یا ''امتیاز سپر اسٹورز'' والے کہیں کہ ہم اپنے تمام صارفین کو گاڑی کی قرعہ اندازی میں شامل کرتے ہیں اور اس کے لئے کسٹمر پر کوئی شرط نہیں ہوگی، پھر چاہے کوئی پانچ روپے کی خریداری کرے یا پانچ ہزار کی، سب اس قرعہ اندازی میں شامل ہوں گے۔ اِسی طرح جیز کمپنی کے صارفین پر بھی بیلنس کی مد میں کوئی رقم خرچ کرنے کی پابندی نہ ہوگی تو یہ جائز ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔



✵ **خلاصہ:**

مختصراً یہ کہ اگر کسی انعامی اسکیم میں شامل ہونے کے لئے آپ کو کوئی مخصوص رقم خرچ کرنی پڑتی ہے اور اس کے بعد بھی آپ کو انعام کا ملنا یقینی نہیں ہوتا تو وہ جوا ہے جو کہ حرام ہے۔ البتہ اگر آپ بنا رقم خرچ کئے کسی ایسی اسکیم میں شامل کئے جا رہے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں یا قرعہ اندازی میں انعام نکل آنے کی صورت میں انعام کو حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں یہ جائز ہے۔





کریڈٹ و ڈیبٹ کارڈ پر ڈسکاؤنٹ آفرز کا شرعی حکم

جدید بینکنگ کے حوالے سے ایک اور قابل ذکر مسئلہ جس کے بارے میں عام طور پر کریڈٹ یا ڈیبٹ کارڈ پر ڈسکاؤنٹ آفرز کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے۔



ڈسکاؤنٹ آفرز کی وضاحت

اس قسم کی آفرز سے مراد یہ ہے کہ مالیاتی اداروں (Banks) کی طرف سے کریڈٹ کارڈ اور ڈیبٹ کارڈ پر مخصوص قسم کے انعامات رکھے جاتے ہیں، جیسے کسی خاص چیز کی خریداری کریڈٹ کارڈ یا ڈیبٹ کارڈ کے ذریعے کرنے پر خاص رعایت ملتی ہے، جسے کاروباری زبان میں ''ڈسکاؤنٹ آفر'' کہا جاتا ہے، جس میں فیصد کے حساب سے قیمت پر رعایت دی جاتی ہے۔

✵ مثال کے طور پر:

مختلف مالیاتی ادارے (Banks) کریڈٹ کارڈ یا ڈیبٹ کارڈ پر ایک آفر پیش کرتے ہیں کہ اگر ان کے کارڈ کو استعمال کرتے ہوئے صارف کسی مقرر کردہ برانڈ کی کوئی چیز خریدتا ہے تو اُسے اُس چیز کی قیمت میں 10 فیصد یا 20 فیصد رعایت ملے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ مالیاتی اداروں (Banks) کی طرف سے دی گئی ایسی کسی آفر سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

شرعی حکم

سب سے پہلی بات تو یہ کہ کریڈٹ کارڈ اور ڈیبٹ کارڈ دو مختلف سروسز ہیں۔

کریڈٹ کارڈ حرام ہے کیونکہ اس کے معاہدے میں بینک کی طرف سے ایک ایسی شق شامل کر دی جاتی ہے جو اسے سُود کے لین دین میں بدل دیتی ہے۔ (اگرچہ بینکنگ میں اس کے لئے کچھ مخصوص اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں جس سے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ اس کارڈ کے تحت حاصل کی جانے والی سروس کا حصہ ہے لیکن بنیادی طور پر وہ معاملہ سُود ہی کا ہوتا ہے) اور باوجود اس کے کہ صارف ایسا کوئی کاروبار نہیں کر رہا جس میں سُود ہو لیکن صرف معاہدے کی اُس شق پر رضامندی ظاہر کرنے کی وجہ سے وہ اِس حرام کام کا حصہ بن جاتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ہمارے مضمون کریڈٹ کارڈ کا شرعی حکم کا مطالعہ کیا جائے۔

جہاں تک ڈیبٹ کارڈ کا معاملہ ہے چونکہ یہ کریڈٹ کارڈ سے یکسر مختلف ہے تو ڈیبٹ کارڈ کے ذریعے ایسی کسی رعایتی آفر سے فائدہ حاکرنا کیسا ہے؟ مثال کے طور پر آپ ایک موبائل فون خریدنا چاہتے ہیں اور اس موبائل کی قیمت دس ہزار روپے ہے، لیکن ڈیبٹ کارڈ پر دس فیصد رعایت کی وجہ سے اس کی قیمت نو ہزار 9000 روپے ہو جاتی ہے۔ نتیجتاً آپ کو اس موبائل فون کی خریداری پر ایک ہزار روپے کی رعایت ملی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر آپ نے وہ ایک ہزار روپے نہیں دیئے جس سے موبائل کی قیمت پوری ہونی تھی اور اُس دوکاندار نے بھی اپنی طرف سے وہ پیسے نہیں دئے تو پھر وہ پیسے کس نے دیئے؟ جبکہ موبائل

کی قیمت دس ہزار ہی ہے اور دوکاندار بھی اِسی قیمت پر یہ موبائل فون بیچ رہا ہے۔

تو یہاں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک ہزر روپے ہماری طرف سے دوکاندار کو بینک نے ادا کیے جس کی وجہ سے ہمیں رعایت ملی۔ بظاہر اس میں کوئی حرج نہیں کہ بینک نے ہمیں بطور تحفہ یہ رعایت دی ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ بینک کی اپنی جو بھی کمائی ہے وہ سُودی کاروبار پر منحصر ہے اور ظاہر ہے بینک نے آپ کو جو رعایت دی ہے وہ اسی سُودی کاروبار سے حاصل ہونے والے منافع سے دی ہے۔

واضح رہے کہ جس شخص یا جس کمپنی کی کمائی میں سُود شامل ہو یا اس کے لین دین میں سُود شامل ہو تو وہ کمائی اور لین دین دونوں حرام ہیں اور اُس شخص یا اُس کمپنی کی طرف سے دیا جانے والا تحفہ بھی حرام ہے۔ اسی بنا پر ہمیں بینک کی طرف سے دی گئی کسی رعایتی آفر سے فائدہ حاصل نہیں کرنا چاہیے یہ علماء کا متفقہ فیصلہ ہے جو کہ صحیح اور قابل فہم بھی ہے۔

لہٰذا یہ بات واضح ہوگئی کہ کریڈٹ کارڈ تو ویسے ہی حرام ہے اور ڈیبٹ کارڈ پر بھی ڈسکاؤنٹ لینا جائز نہیں ہے۔

یہاں کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ بینک وہ رعایتی قیمت پیسے کی صورت میں ادا نہیں کر رہا ہوتا۔ تو یہ ضروری نہیں ہے کہ قیمت ہی ادا کی جائے بلکہ مارکیٹنگ کے اصولوں کے تحت جب صارف بینک کے کارڈ پر دی گئی آفر کو حاصل کر لیتا ہے تو بینک اس کے عوض میں رقم کی بجائے دیگر سروسز بھی دوکاندار کو فراہم کردتا ہے ، یہ ایک صورت ہے اور ایسی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں جیسے مارکیٹنگ ، سروسز یا کچھ اور۔ لیکن چونکہ بینک وہ رعایتی قیمت یا اس قیمت کے عوض کوئی سروس ، کسی نہ کسی صارف کی جانب سے رعایتی آفر حاصل کرنے پر ہی فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا کریڈٹ کارڈ کا ڈسکاؤنٹ یا ڈیبٹ کارڈ کا ڈسکاؤنٹ اس کے لیے کسی بھی حالت میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

کیا ایزی پیسہ اور جیز کیش آفرز استعمال کرنا جائز ہے؟

دورِ جدید میں جہاں دیگر چیزوں نے ترقی کی وہیں تجارتی ذرائع اور کاروباری طریقوں میں بھی جدت آ گئی ہے۔ جیسے پہلے بینک کے معمولی معاملات کے لئے بھی صارف کا بینک کی برانچ میں جانا ضروری ہوتا تھا۔ پھر انٹرنیٹ آیا اور آہستہ آہستہ سارے بینک اپنے سسٹم سمیت آن لائن ہو گئے۔ اب ہمارے پاس موبائل فون ہے جس میں موبائل بینکنگ کی سہولت بھی میسر ہے۔ اسی طرح ترسیلِ زر کے لئے دیگر کئی سروسز جن میں معروف نام ”ایزی پیسہ“، ”جیز کیش“ اور اس قسم کی دیگر کمپنیاں ہیں جن کی سروسز دراصل موبائل بینکنگ ہیں۔

موبائل بینکنگ کی آفر

ہم موبائل بینکنگ کی طرح ان سروسز کے اکاؤنٹس میں رقم ڈپازٹ کرواتے ہیں، پھر ان موبائل ایپلی کیشنز کے ذریعے مطلوبہ خریداری کرتے ہیں یعنی خریدی ہوئی چیز کی قیمت ادا کر دیتے ہیں۔ اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے کیونکہ یہ سب چیزیں روزمرہ کے معاملات میں آسانی اور سہولت کے لئے ہی بنائی گئی ہیں۔ لیکن ایک چیز جس کے بارے میں اکثر پوچھا جاتا ہے جو کہ مشتبہ بھی ہے کہ ایزی پیسہ یا جیز کیش کی طرف سے آفرز ملتی ہیں کہ اگر آپ اپنے ایزی پیسہ یا جیز کیش اکاؤنٹ میں مقررہ رقم ڈپازٹ کریں گے تو آپ کے موبائل بیلنس میں مقررہ رقم ریچارج ہو جائے گی۔

مذکورہ آفر کی حقیقت

یہاں جس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ایزی پیسہ یا جیز کیش کے ذریعے خریداری یا رقم کی ترسیل حقیقتاً موبائل بینکنگ ہے۔ مثال کے طور پر جس طرح ہم بینک اکاؤنٹ میں جب اپنی رقم ڈپازٹ کرواتے ہیں تو وہ رقم بینک پر ایک قرض ہوتا ہے۔ اور شریعت کا ایک اُصول ہے جس کو علماء نے اس طرح بیان کیا گیا کہ:

"کُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نفعًا فهو رِبًا"

"جس قرض کے ذریعے سے کوئی نفع حاصل کیا جائے تو وہ سُود ہو جاتا ہے۔"

لہٰذا اگر ہم ایسی کسی ایپلی کیشن کو استعمال کرتے ہوئے اُس میں رقم ڈپازٹ کریں اور اُس ڈپازٹ پر ہمیں کوئی انعام ملے تو اسے استعمال کرنا ہمارے لئے جائز نہیں ہے۔ کیونکہ جو چیز انعام کی صورت میں ہمیں ملی ہے وہ رقم اکاؤنٹ میں ڈپازٹ کروانے کی وجہ سے ملی ہے۔ ایزی پیسہ یا جیز کیش کی سروس کو استعمال کرتے ہوئے اگر ہم اپنی رقم کی ترسیل کر رہے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

البتہ اگر اِن ایپلی کیشنز میں رقم ڈپازٹ کروا کر کوئی انعام لیا جائے تو یہ بینک کے سیونگ اکاؤنٹ کی طرح کا معاملہ ہو گا جس طرح صارف کی طرف سے سیونگ اکاؤنٹ میں رقم رکھوائی جاتی ہے جس پر بینک ہر ماہ منافع کے نام سے صارف کو ایک مخصوص رقم ادا کرتا ہے اور صارف کی اصل رقم بینک میں اُسی طرح رکھی رہتی ہے۔ یا پھر یہ کہ کمپنی کی طرف سے بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ اگر آپ اتنی رقم اکاؤنٹ میں رکھتے ہیں تو آپ کو اتنا بیلنس ملے گا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ ایسی کسی آفر یا انعام سے فائدہ حاصل کرنا شریعت کی رُو سے جائز نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو حلال اختیار کرنے کی اور حرام سے بچنے کی توفیق عطاء فرمائے۔

آمین

حدیث قرطاس

موجب طعن عمر رضی اللہ عنہ نہیں

الشیخ عبد الوکیل ناصر حفظہ اللہ [1]

حدیث قرطاس کیا ہے ؟اس کا پس منظر کچھ یوں ہے ، جمعرات کا دن ہے حجرہ رسول مقبول ﷺ میں بالخصوص امہات المومنین ، دیگر اہل بیت اطہار اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود ہیں

حبیبِ کبریا ، شافع روز جزاء محبوب رب العالمین رحمۃ للعالمین ﷺ اپنے مرض الموت میں شدید حالت تکلیف میں ہیں ، جاں نثاران پیغمبر اس رنج والم کی گھڑی میں اپنی نگاہوں کا محور فقط چہر پر نور ، چہرہ سراج منیر کو بنائے ہوئے ہیں۔

ایسے میں زبانِ وحی ترجمان سے ارشاد ہوا '' مجھے قلم وقرطاس (کاغذ و دیگر لکھنے کا سامان) لادو میں کچھ لکھوا دوں تا کہ تم بعد میں بھول نہ جاؤ ، بہک نہ جاؤ۔ ''

مخاطب کو کوئی ایک شخص نہیں دکھائی دیتا قبل اس کے کہ حاضرین وسامعین اور ناظرین ، حبیب کبریاء کے پروانے کچھ سمجھیں کچھ کہیں ، ایک جان نثار کی آواز ابھری ، آپ ﷺ پر تکلیف کا غلبہ ہے اور ہمارے پاس کتاب اللہ بھی ہے ، جو ہمیں کافی ہو سکتی ہے۔

اس نے فقط محبت کا اظہار کیا ، اپنے پیغام سے پیغام دیا کہ رحمت عالم کو اس عالم میں کہ جب آپ شدید کرب والم میں ہیں لکھنے کی زحمت نہ دی جائے ، فقط محبت کا اظہار ، نہ انکار نہ محض تکرار۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تمام حاضرین مجلس باہم مختلف آراء کا اظہار کرنے لگے ، غم واندوہ کی اس گھڑی میں کچھ سجھائی نہ دیا بلکہ بے ساختہ کچھ آوازیں بلند ہو گئیں ، سنائی دینے لگیں۔

کوئی اثبات میں بولا تو کوئی انکار میں ، کوئی سمجھانے کو بولا تو کوئی چپ کروانے کو بولا۔

[1] نائب شیخ الحدیث جامعہ الاحسان الاسلامیہ کراچی

اسی اثناء میں رسول اللہ ﷺ گویا ہوئے ”تم سب میرے پاس سے اٹھ جاؤ“ پیغمبر کے پاس تنازع مناسب وجائز نہیں ہے۔

چارو ناچار سب ہی محفل سے برخاست ہو گئے اور بعد از اں یہ نہ سمجھ میں آنے والا ”اختلاف، اختصام، شور وغل یاد کر کے ابن عمر رضی اللہ عنہ تاحیات روتے رہے۔



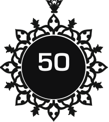
”قدر الله ماشاء وفعل، وما تشآؤن إلا ان يشاء الله رب العالمين“

جی ہاں یہ وہ مختصر ترین منظر کشی ہے جسے واقعہ قرطاس اور حدیث قرطاس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اللہ کا دین محکم ومتشابہ آیات واحکام پر مشتمل ہے اور خود اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے دلوں کو ”زیغ شدہ“ قرار دیا جو محکم کو چھوڑ کر متشابہ کے پیچھے لگتے ہیں۔



اور یہ بھی کہا کہ وہی لوگ فتنہ پرور ہیں



جبکہ قاعدہ الٰہیہ یہ ہے کہ ﴿نَبۡلُوۡكُمۡ بِالشَّرِّ وَالۡخَيۡرِ فِتۡنَةً﴾ اور ﴿وَبَلَوۡنَاهُم بِالۡحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ﴾ آزمائش خیر وشر دونوں پہلوؤں سے ہوتی ہے۔



فتنہ اور آزمائش کی ایک شکل یہ بھی سامنے آئی ہے کہ صحیح بخاری میں متعدد مقامات پر وارد ”واقعہ قرطاس“ پر اعدائے صحابہ کی ریشہ دوانیاں اور موشگافیاں منہ زوری کی حد تک جا چکی ہیں تو بفضل اللہ دفاع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالخصوص دفاع سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی غرض سے اور اس واقعہ کی صحیح وحقیقی شکل وتوجیہ اور اس کے مختلف الفاظ کی تجمیع وتفہیم اور فہم سلف کی روشنی میں اس کی توضیح وتبیین کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ چند اوراق مرتب کیے ہیں تا کہ دشمن کے نظریات کے تاروپود بکھریں اور جمیع اہل السنہ کے اکابر واصاغر کو تسکین صدور واذھان ملے۔



یہ کام اس لیے بھی ضروری تھا کہ اغیار کے ساتھ کچھ احباب بھی علمی رسوخ اور تتبع الفاظ سے تشنہ لب رہنے کی وجہ سے کبھی حیران وپریشان ہوتے ہیں تو امید ہے اس تحریر سے وہ کچھ استفادہ کر کے کسی کی یا خود اپنی راہ ہدایت کی ہمواری کے قابل ہو سکیں تو یہ بے ربط تحریر ہمارے لیے صدقہ جاریہ ہو گی ان شاء اللہ۔ وباللہ التوفیق

حدیث قرطاس کے صحیح بخاری میں مختلف الفاظ

کتاب العلم، باب کتابة العلم،حدیث نمبر114

عربی متن درج ذیل ہے

1 عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ:''لَمَّا اشْتَدَّ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعُهُ قَالَ: ''ائْتُونِي بِكِتَابٍ أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لاَ تَضِلُّوا بَعْدَهُ'' قَالَ عُمَرُ إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَلَبَهُ الوَجَعُ، وَعِنْدَنَا كِتَابُ اللَّهِ حَسْبُنَا. فَاخْتَلَفُوا وَكَثُرَ اللَّغَطُ، قَالَ:''قُومُوا عَنِّي، وَلاَ يَنْبَغِي عِنْدِي التَّنَازُعُ'' فَخَرَجَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَقُولُ:''إِنَّ الرَّزِيَّةَ كُلَّ الرَّزِيَّةِ، مَا حَالَ بَيْنَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبَيْنَ كِتَابِهِ۔''[1]

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے فرمایا ''جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بہت بیمار ہو گئے تو آپ نے فرمایا لکھنے کا سامان لاؤ تا کہ میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد میں تم گمراہ نہیں ہو گے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بیماری کا غلبہ ہے اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے وہ ہمیں کافی ہے۔لوگوں نے اختلاف شروع کر دیا اور شور وغل مچ گیا۔تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے پاس سے اٹھ جاؤ، میرے ہاں لڑائی جھگڑے کا کیا کام ہے؟

پھر ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی یہ کہتے نکل آئے کہ تمام مصائب سے بڑی وہ مصیبت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تحریر کے درمیان حائل ہو گئی۔

عربی متن:

2 عن ابن عباس رضی اللّٰه عنه:''أنه قال یوم الخمیس وما یوم الخمیس؟ثم بکی،حتی خضب دمعه الحصباء فقال: اشتد برسول اللّٰه وجعه یوم الخمیس فقال أئتونی بکتاب أکتب لکم لن تضلوا بعده أبداً فتنازعوا ولا

[1] صحیح البخاری، کتاب العلم:114

ينبغى عند نبى تنازع فقالوا هجر رسول الله ﷺ قال دعونى فالذى انا فيه خيرمما تدعونى إليه و أوصىٰ عند موته بثلاث اخرجو المشركين من جزيرة العرب وأجيزوا الوفد بنحو ماكنت أجيزهم ونسيت الثالثة۔“

ترجمہ: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے کہا جمعرات کا دن کیا ہے؟ جمعرات کا دن؟ اس کے بعد وہ اس قدر روئے کہ آنسوؤں سے زمین کی کنکریاں تر ہوگئیں پھر کہنے لگے کہ جمعرات کے دن رسول اللہ ﷺ کی بیماری زیادہ ہوگئی تو آپ نے فرمایا: ”میرے پاس لکھنے کے لیے کچھ لاؤ تا کہ میں تمہیں ایک تحریر لکھوادوں تم اس کے بعد ہرگز گمراہ نہیں ہوگے۔ لیکن لوگوں نے اختلاف کیا اور نبی کے پاس جھگڑا مناسب نہیں پھر لوگوں نے کہا رسول اللہ ﷺ توجدائی کی باتیں کررہے ہیں آپ نے فرمایا: مجھے (میرے حال پر) چھوڑ دو کیونکہ میں جس حالت میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی جانب تم مجھے بلارہے ہو اور آپ نے اپنی وفات کے وقت تین باتوں کی وصیت فرمائی۔[1]

مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دینا اور قاصدوں کو اسی طرح انعام دینا جس طرح میں دیتا تھا۔ راوی کہتے ہیں میں تیسری بات بھول گیا ہوں۔

عَنْ سَعِيدَ بْنَ جُبَيْرٍ، سَمِعَ ابْنَ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، يَقُولُ: يَوْمُ الخَمِيسِ وَمَا يَوْمُ الخَمِيسِ، ثُمَّ بَكَى حَتَّى بَلَّ دَمْعُهُ الحَصَى، قُلْتُ يَا ابن عَبَّاسٍ: مَا يَوْمُ الخَمِيسِ؟ قَالَ: اشْتَدَّ بِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعُهُ، فَقَالَ: ”ائْتُونِي بِكَتِفٍ أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لاَ تَضِلُّوا بَعْدَهُ أَبَدًا، فَتَنَازَعُوا، وَلاَ يَنْبَغِي عِنْدَ نَبِيٍّ تَنَازُعٍ، فَقَالُوا: مَا لَهُ أَهَجَرَ اسْتَفْهِمُوهُ؟ فَقَالَ: ”ذَرُونِي، فَالَّذِي أَنَا فِيهِ خَيْرٌ مِمَّا تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ“، فَأَمَرَهُمْ بِثَلاَثٍ، قَالَ: ”أَخْرِجُوا المُشْرِكِينَ مِنْ جَزِيرَةِ العَرَبِ،وَأَجِيزُوا الوَفْدَ بِنَحْوِ مَا

[1] صحیح البخاری،کتاب الجهاد والسیر،باب هل یستشفع إلى أهل الذمة و معاملاتهم حدیث :3053

كُنْتُ أُجِيزُهُمْ '' وَالثَّالِثَةُ، إِمَّا أَنْ سَكَتَ عَنْهَا، وَإِمَّا أَنْ قَالَهَا فَنَسِيتُهَا، [1]

ترجمہ: ''سیدنا سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ انہوں نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ کہتے ہوئے سنا: جمعرات کا دن آہ! جمعرات کا دن کیسا (ہیبت ناک) تھا پھر رو پڑے یہاں تک کہ آپ نے آنسوؤں سے کنکریاں تر کر دیں۔ میں نے عرض کیا ابن عباس! جمعرات کا دن کیسا تھا؟ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری سنگین ہوگئی، تو آپ نے فرمایا: ''میرے پاس شانے کی کوئی ہڈی لاؤ میں تمہارے لیے کچھ تحریر کر دوں کہ اس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ اس کے بعد لوگ باہم جھگڑنے لگے۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جھگڑنا نہیں چاہیے تھا۔ لوگوں نے کہا آپ کو کیا ہوگیا ہے؟





کیا آپ دنیا سے ہجرت فرما رہے ہیں؟ اچھی طرح آپ کی بات سمجھو، آپ نے فرمایا: تم مجھے چھوڑ دو میں جس حال میں ہوں وہ اس حال سے اچھا ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو۔ پھر آپ نے انہیں تین امور کا حکم دیا، آپ نے فرمایا: مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دو ایک اور دوسرے ممالک سے آنے والے وفد کو عطایا دو، جیسے میں انہیں عطایا دیا کرتا تھا، راوی کہتے ہیں تیسری بات سے آپ نے سکوت فرمایا یا آپ نے بیان کی لیکن میں بھول گیا۔''





قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: يَوْمُ الْخَمِيسِ وَمَا يَوْمُ الْخَمِيسِ؟ اشْتَدَّ بِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعُهُ فَقَالَ، ائْتُونِي أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ أَبَدًا فَتَنَازَعُوا وَلَا يَنْبَغِي عِنْدَ نَبِيٍّ تَنَازُعٌ، فَقَالُوا مَا شَأْنُهُ أَهَجَرَ اسْتَفْهِمُوهُ فَذَهَبُوا يَرُدُّونَ عَلَيْهِ، فَقَالَ: دَعُونِي فَالَّذِي أَنَا فِيهِ خَيْرٌ مِمَّا تَدْعُونِي إِلَيْهِ وَأَوْصَاهُمْ بِثَلَاثٍ، قَالَ: أَخْرِجُوا الْمُشْرِكِينَ مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَأَجِيزُوا الْوَفْدَ بِنَحْوِ مَا كُنْتُ أُجِيزُهُمْ وَسَكَتَ عَنْ الثَّالِثَةِ أَوْ قَالَ فَنَسِيتُهَا۔ [2]



ترجمہ: ''سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے جمعرات کے دن کا ذکر کیا اور فرمایا تمہیں کیا

[1] صحيح البخاري: كتاب الجزية والموادعة، باب اخراج اليهود من جزيرة العرب حديث :3168

[2] صحيح البخاري: كتاب المغازي، باب مرض النبى صلى الله عليه وسلم ووفاته، حديث نمبر:4431

معلوم کہ جمعرات کے دن کیا ہوا تھا اس دن رسول اللہ ﷺ کے مرض میں شدت پیدا ہوئی اس وقت آپ نے فرمایا: میرے پاس آؤ میں تمہیں کوئی دستاویز لکھ دوں کہ اس کے بعد تم کبھی صحیح راستے کو نہ چھوڑو گے۔ لیکن وہاں اختلاف ہو گیا حالانکہ نبی ﷺ کے سامنے اختلاف نہیں ہونا چاہیے تھا کچھ لوگوں نے کہا آپ کا کیا حال ہے؟ کیا آپ شدت مرض کی وجہ سے بے معنی کلام کر رہے ہیں؟ آپ سے بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے پوچھنے لگے تو آپ نے فرمایا جاؤ میں جس کام میں مشغول ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کے لیے تم کہہ رہے ہو۔ اس کے بعد آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تین چیزوں کی وصیت فرمائی۔ آپ نے فرمایا: مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دو اور آنے والے وفود کی اس طرح خاطر تواضع کرنا جس طرح میں کرتا آیا ہوں۔ تیسری بات کو راوی نے بیان نہیں کیا یا اس نے کہا کہ میں تیسری بات بھول گیا ہوں۔

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ لَمَّا حُضِرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِي الْبَيْتِ رِجَالٌ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلُمُّوا أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَا تَضِلُّوا بَعْدَهُ فَقَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ غَلَبَهُ الْوَجَعُ وَعِنْدَكُمْ الْقُرْآنُ حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ فَاخْتَلَفَ أَهْلُ الْبَيْتِ وَاخْتَصَمُوا فَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ قَرِّبُوا يَكْتُبُ لَكُمْ كِتَابًا لَا تَضِلُّوا بَعْدَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ غَيْرَ ذَلِكَ فَلَمَّا أَكْثَرُوا اللَّغْوَ وَالِاخْتِلَافَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُومُوا قَالَ عُبَيْدُ اللَّهِ فَكَانَ يَقُولُ ابْنُ عَبَّاسٍ إِنَّ الرَّزِيَّةَ كُلَّ الرَّزِيَّةِ مَا حَالَ بَيْنَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبَيْنَ أَنْ يَكْتُبَ لَهُمْ ذَلِكَ الْكِتَابَ لِاخْتِلَافِهِمْ وَلَغَطِهِمْ۔[1]

ترجمہ: "سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات کا وقت قریب آیا اور گھر میں کچھ لوگ موجود تھے تو نبی ﷺ نے فرمایا: آؤ میں تمہیں ایسی دستاویز

[1] صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب مرض النبى ﷺ ووفاته، حديث نمبر 4432

لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہو گے۔ بعض حضرات نے کہا رسول اللہ ﷺ پر بیماری کا غلبہ ہے جبکہ تمہارے پاس قرآن مجید موجود ہے اور اللہ کی کتاب ہمیں کافی ہے چنانچہ گھر والوں میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا جس کی بنا پر وہ جھگڑنے لگے۔ ان میں سے کچھ کہتے تھے کہ کاغذ اور دوات کو آپ کے قریب کر دیا جائے تاکہ تمہارے لیے ایسی دستاویز لکھ دیں جس کے بعد گمراہی کا اندیشہ نہ رہے جبکہ کچھ حضرات اس کے خلاف تھے۔''

جب لوگوں کی بے فائدہ باتیں زیادہ ہونے لگیں اور اختلاف کا آغاز ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔ عبید اللہ کہتے ہے کہ سیدنا ابن عباس کہا کرتے تھے یہ کیسی مصیبت ہے جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے تحریر کرنے کے درمیان ان کی بے فائدہ گفتگو اور اختلاف کے سبب حائل ہوئی۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ: لَمَّا حُضِرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِي البَيْتِ رِجَالٌ، فِيهِمْ عُمَرُ بْنُ الخَطَّابِ، قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''هَلُمَّ أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لاَ تَضِلُّوا بَعْدَهُ'' فَقَالَ عُمَرُ: إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ غَلَبَ عَلَيْهِ الوَجَعُ، وَعِنْدَكُمُ القُرْآنُ، حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ. فَاخْتَلَفَ أَهْلُ البَيْتِ فَاخْتَصَمُوا، مِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ: قَرِّبُوا يَكْتُبْ لَكُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِتَابًا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ، وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ مَا قَالَ عُمَرُ، فَلَمَّا أَكْثَرُوا اللَّغْوَ وَالِاخْتِلاَفَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''قُومُوا'' قَالَ عُبَيْدُ اللَّهِ: فَكَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ، يَقُولُ: ''إِنَّ الرَّزِيَّةَ كُلَّ الرَّزِيَّةِ مَا حَالَ بَيْنَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبَيْنَ أَنْ يَكْتُبَ لَهُمْ ذَلِكَ الكِتَابَ، مِنَ اخْتِلاَفِهِمْ وَلَغَطِهِمْ۔[1]

ترجمہ: ''سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے کہا جب رسول اللہ ﷺ کی وفات

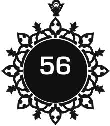
[1] صحيح البخاري:كتاب المرضى،باب قول المريض قوموا عني حديث :5669

کا وقت قریب آیا تو گھر میں کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ ان میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”آؤ میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دوں اس کے بعد تم گمراہ نہیں ہو گے۔ سیدنا عمر نے کہا بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بیماری کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن مجید موجود ہے ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے اس مسئلے پر گھر میں موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہو گیا اور وہ بحث وتمحیص کرنے لگے بعض نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں اسباب کتابت قریب کرو تا کہ رسول اللہ ایسی تحریر لکھ دیں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہوسکو اور کچھ صحابہ وہ کہتے تھے جو سیدنا عمر نے کہا تھا بہر حال جب لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بے مقصد باتیں زیادہ کیں اور جھگڑا کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (یہاں سے) چلے جاؤ۔“





سیدنا عبید اللہ نے بیان کیا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے سب سے زیادہ افسوسناک بات یہی ہے کہ لوگوں کے اختلاف اور بحث وتمحیص کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ تحریر نہ لکھوا سکے جو آپ مسلمانوں کے لیے لکھنا چاہتے تھے۔





عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ” لَمَّا حُضِرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَفِي الْبَيْتِ رِجَالٌ فِيهِمْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ قَالَ هَلُمَّ أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ قَالَ عُمَرُ إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَلَبَهُ الْوَجَعُ وَعِنْدَكُمْ الْقُرْآنُ فَحَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ وَاخْتَلَفَ أَهْلُ الْبَيْتِ وَاخْتَصَمُوا فَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ قَرِّبُوا يَكْتُبْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِتَابًا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ مَا قَالَ عُمَرُ فَلَمَّا أَكْثَرُوا اللَّغَطَ وَالِاخْتِلَافَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قُومُوا عَنِّي قَالَ عُبَيْدُ اللَّهِ فَكَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَقُولُ إِنَّ الرَّزِيَّةَ كُلَّ الرَّزِيَّةِ مَا حَالَ بَيْنَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبَيْنَ أَنْ يَكْتُبَ لَهُمْ ذَلِكَ الْكِتَابَ مِنْ اخْتِلَافِهِمْ وَلَغَطِهِمْ۔ [1]



ترجمہ: ”سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے کہا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت

[1] كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة باب كراهية الاختلاف، حديث :7366

قریب آیا تو گھر میں بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ان میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آؤ میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دوں کہ اس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تکلیف میں مبتلا ہیں تمہارے پاس قرآن موجود ہے اور ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔ گھر کے لوگوں میں بھی اختلاف ہو گیا اور وہ آپس میں جھگڑنے لگے۔ کچھ کہنے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب (لکھنے کا سامان) کر دو، وہ تمہارے لیے ایسی تحریر لکھ دیں کہ اس کے بعد تم گمراہ نہیں ہوگے اور کچھ حضرات نے وہی بات کہی جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہہ چکے تھے۔

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شور وغل اور اختلاف زیادہ ہو گیا تو آپ نے فرمایا میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔ عبید اللہ کہتے ہیں سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے سب سے بھاری مصیبت تو یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس نوشت لکھوانے کے درمیان اختلاف اور جھگڑا حائل ہوا۔"

صحیح مسلم کی ایک روایت میں تو وہی الفاظ ہیں جو متعدد بار صحیح بخاری میں ذکر ہوئے ہیں اور ہم نے بحمد اللہ تحریر بھی کر دیے ہیں۔ البتہ صحیح مسلم حدیث نمبر 4233 میں درج ذیل الفاظ آئے ہیں۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّهُ قَالَ: "يَوْمُ الْخَمِيسِ، وَمَا يَوْمُ الْخَمِيسِ ثُمَّ جَعَلَ تَسِيلُ دُمُوعُهُ، حَتَّى رَأَيْتُ عَلَى خَدَّيْهِ كَأَنَّهَا نِظَامُ اللُّؤْلُؤِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "ائْتُونِي بِالْكَتِفِ وَالدَّوَاةِ -أَوِ اللَّوْحِ وَالدَّوَاةِ- أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ أَبَدًا"، فَقَالُوا: إِنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَهْجُرُ۔"[1]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جمعرات کا دن، جمعرات کا دن بھی کیا ہی عجیب تھا؟ پھر ان کے آنسو جاری ہو گئے سعید کہتے ہیں میں نے آنسوؤں کو ان کی رخساروں پر اس طرح دیکھا گویا کہ وہ موتیوں کی لڑی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " میرے پاس شانے کی ہڈی اور دوات یا تختی اور

[1] صحيح مسلم،كتاب الوصية،باب ترک الوصية لمن ليس له شيء يوصي فيه،حديث نمبر 4232،بحواله تحفة المسلم شرح صحيح مسلم نعمانى كتب خانه جلد نمبر 5 صفحه نمبر 250

دوات لاؤ تمہیں ایک تحریر لکھوا دوں، اس کے بعد تم ہرگز سرگرداں نہیں ہو گے تو صحابہ نے سمجھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم داغ مفارقت دے رہے ہیں۔

اس کے بعد اسی صحیح مسلم میں حدیث نمبر 4234 پر تقریباً وہی متن ہے جو صحیح بخاری کے حوالے سے گزر چکا ہے۔

دعوت فکر

حدیثِ قرطاس یعنی وہ روایت یا روایات کہ جس کے بیان وایضاح میں ہم اس وقت قلم وقرطاس سنبھالے ہوئے ہیں اپنے تمام طرق والفاظ کے ساتھ قارئین کے سامنے ہے۔

غور سے دیکھ لیجیے کہ اس میں قلم، قرطاس، دوات ودیگر ادواتِ تحریر لانے کا حکم نبوی کس کو ہے؟ کون اس کا مخاطب ہے؟ کون اس کے لانے کا منکر ہے؟ کون کون محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس امر میں مانع ہے؟ اور یہاں کون سے الفاظ وقرائن ہیں کہ جن سے خلافت علی رضی اللہ عنہ کا خود ساختہ نظریہ کشید کیا جا سکتا ہے؟

اور کیا اُس وقت وہ اہل بیت رسول واصحاب قرابت ومصاہرت بھی اس نظریہ کے قائل وپرچارک تھے؟ یا بعد میں کبھی اس واقعہ کو بنیاد بنا کر کسی فرد یا کسی شرعی خلیفہ کے خلاف ہرزہ سرائی پر آمادہ ہوئے ہوں؟ کلا وحاشا بس اتنا ہی ملتا ہے کہ

❁ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کسی تحریر کے متمنی تھے مگر اس کے بعد بھی آپ 4 روز بقید حیات رہے اور اس مسئلہ میں خاموش ہی رہے معاملہ کیا تھا مخفی ہی رہا۔

❁ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب کون تھے؟ یہاں صراحت نہیں مگر مسند احمد میں وضاحت ہے کہ مخاطب سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ تھے اور یہ عین قرین قیاس وصواب ہے۔

❁ امر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل میں رکاوٹ کون بنا؟ یہاں صراحت نہیں مگر مسند احمد کی روایت مذکورہ میں غور وخوض کریں تو واضح ہے کہ جو مخاطب تھے وہ بھی قلم وقرطاس لیکر حاضر خدمت نہ ہوئے اور یہ کوئی عیب نہیں کسی کے لیے بھی نہیں۔

✵ سید نا عمر رضی اللہ عنہ کا حسبنا کتاب اللہ کہنا فقط اپنی رائے کا اظہار ہے جیسا کہ واضح ہے اور پھر وہ اس جملہ سے قبل یہ واضح کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تکلیف میں مبتلا ہیں لہٰذا اس موقع پر ایک جانثار اور وفاشعار اپنے جذبات کا اظہار اور کیسے کر سکتا تھا؟

✵ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت اور اس موقع کے قریب کے زمانے میں کون شخص ایسا دکھائی دیتا جس نے اس بنیاد پر سید نا عمر رضی اللہ عنہ پر لب کشائی کی ہو؟ کسی ایک فرد کا نام ہو یا خانوادہ پیغمبر ہی میں سے کوئی اٹھتا اور امیر عمر رضی اللہ عنہ پر بات کرتا مگر ایسا نہیں قطعاً نہیں۔

✵ خود سید نا علی رضی اللہ عنہ نے کبھی اس بنیاد پر اپنی خلافت کا دعویٰ کیا ہو؟ یا سید نا عمر رضی اللہ عنہ پر نقد کیا ہو؟ کتب اہل السنہ و کتب اہل التشیع دونوں اس سلسلے میں یکسر خاموش ہیں۔

ذکر کردہ احادیث پر شارحین کا کلام

ہدایۃ القاری شرح صحیح البخاری میں حدیث نمبر 114 کے تحت لکھا ہے یہ حدیث، حدیثِ قرطاس کے نام سے مشہور ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چار دن قبل جمعرات کے دن یہ واقعہ ہوا مسند احمد میں ہے کہ آپ نے سید نا علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ وہ شانے کی ہڈی لائیں تا کہ میں اس پر امت کی گمراہی کے تدارک کے لیے کچھ لکھوا دوں۔

سید نا عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد آپ کے حکم سے گریز نہ تھا بلکہ آپ نے ایسا از راہ محبت فرمایا، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد چار روز تک زندہ رہے، اور دوسرے احکام نافذ فرماتے رہے، جبکہ تحریر کے متعلق آپ نے سکوت اختیار فرمایا۔ معلوم ہوا کہ سید نا عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق تھا۔ بنیادی طور پر یہ حکم تو آپ نے سید نا علی رضی اللہ عنہ کو دیا تھا۔

کم از کم ان سے اس کوتاہی کی توقع ہی نہ تھی اگر یہ حکم ضروری ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے اختلاف کی وجہ سے اسے ترک نہ فرماتے۔

آخری سطور میں لکھا ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر میں فرمایا کہ میرے پاس سے اٹھ جاؤ میرے ہاں لڑائی جھگڑے کا کیا کام ہے؟ آپ کا یہ خطاب تمام شرکاء مجلس کو تھا جس میں سید نا علی رضی اللہ عنہ اور

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔اس حکم کی تعمیل میں سب لوگ گھروں کو چلے گئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی رائے بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے مطابق تھی۔ بصورت دیگر وہی کاغذ وغیرہ لے آتے پھر آپ تو رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے داماد بھی تھے گھر آنا جانا رہتا تھا،سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے گھر چلے جانے کے بعد تو یہ کام بخوبی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ان کی رائے بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی۔ واللہ اعلم

اوراسی شرح ہدایۃ القاری میں حدیث نمبر 3053 کے ذیل میں لکھا ہے۔

بظاہر اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت سے متعلق کچھ تحریر کروانا چاہتے تھے۔

کیونکہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:'' اپنے باپ اور بھائی کو بلاؤ مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی اور اس خلافت کی تمنا کر بیٹھے کہ میں اس کا حق رکھتا ہوں۔'' پھر فرمایا اللہ تعالیٰ اور دیگر اہل اسلام ابو بکر صدیق کے علاوہ کسی اور کو تسلیم نہیں کریں گے۔ [1]

اور حدیث نمبر 4431 کے ذیل میں لکھا ہے:

اس حدیث کو حدیث قرطاس کہتے ہیں رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی وفات پیر کے دن ہوئی اور دستاویز کا واقعہ جمعرات کے دن پیش آیا۔اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلاف ہوا جس کی بنا پر آپ نے دستاویز نہ لکھی اس کے متعلق روافض بہت شور وغل کرتے ہیں۔

دراصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے پر مامور تھے، کسی کے خوف سے آپ فریضہ تبلیغ نہیں چھوڑ سکتے، خصوصاً ایسی چیز جو گمراہی سے بچاتی ہو اسے تو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کر سکتے تھے،ایسی بات ہوتی تو آپ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو روک دیتے جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو روک دیا تھا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ صائب الرائے تھے ان کی رائے کے مطابق کئی موقعوں پر قرآن نازل ہوا۔اگر ایسے

[1] صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة رضي الله عنهم، باب من فضائل أبي بكر الصديق رضی اللہ عنہ حديث: 2387

آدمی نے روک دیا (جیسا کہ کہا جاتا ہے) تو ضرور اس میں کوئی مصلحت ہو گی اور ان کی رائے کی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی (سکوتی) تائید فرمائی۔

اگر ایسا ضروری معاملہ ہوتا تو آپ اس کے بعد بھی تین چار دن زندہ رہے ان ایام میں کسی سے لکھوا لیتے۔ نیز قبل ازیں تکمیل دین کی آیت نازل ہو چکی تھی اب اگر گمراہی سے بچانے والی چیز باقی رہ گئی تو پھر تکمیل دین کے کیا معنی ہوں گے؟

معلوم ہوتا ہے آپ کوئی نئی بات بیان نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ یا تو مفصلات کو مجملاً بیان کرنا چاہتے تھے یا پہلی باتوں میں سے کسی بات کی تاکید کرنا چاہتے تھے جس کے لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو تکلیف دینا ضروری خیال نہ کیا۔

نیز حدیث نمبر 4432 کے تحت لکھا ہے۔

یہ واقعہ وفات سے چار دن پہلے کا ہے جب بیماری نے شدت اختیار کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قلم دوات لاؤ میں تمہیں کچھ لکھ دوں تاکہ تم میرے بعد گمراہ نہ ہو۔" اس امر کی بجا آوری پر اختلاف ہوا۔ کچھ صحابہ کہتے تھے آپ پر شدت مرض کا غلبہ ہے قرآن ہمارے پاس موجود ہے اور وہ ہمیں کافی ہے اور کچھ حضرات کہتے تھے سامان کتابت لے آؤ تاکہ دستاویز لکھ دی جائے۔

دراصل صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرائن سے سمجھ لیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ امر وجوب کے لیے نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو اختلاف کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اس پر عمل کرتے جبکہ اس کے بعد آپ چار دن بقید حیات رہے۔

ان بقیہ ایام میں جو حضرات سامان کتابت لانے کی خواہش رکھتے تھے انہوں نے بھی اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کا انکار نہیں کیا بلکہ خاموشی اختیار کی اور اس کے درست ہونے کا عندیہ دیا اس سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی قوت فہم اور دقت نظر کا پتہ چلتا ہے۔

❁ قارئین ہم نے طوالت سے بچنے کے لیے فقط ہدایۃ القاری شرح صحیح البخاری کے منتخب مقامات کا ذکر کیا ہے وگرنہ دیگر شروحات (عربی و اردو) اور ان کی مکمل بحث بھی پیش کی جاسکتی ہے۔

امام مسلم کی ذکر کردہ حدیث قرطاس پر دیگر شارحین کا کلام

تحفۃ المسلم شرح صحیح مسلم ج5 صفحہ 253 پر لکھا ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا خیال یہ تھا کہ آپ بالترتیب خلفاء کی خلافت تحریر کروا دیتے تو بعد والے جو جھگڑے کھڑے ہوئے اور نوبت جنگ تک پہنچی ہم اس سے بچ جاتے، لیکن کبار صحابہ نے یہ سمجھا کہ دین کی تکمیل کے بعد کوئی نئی بات تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوانی نہیں ہے۔ پہلی باتوں کی تاکید اور توثیق ہی ہوگی یا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خیال کیا آپ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں لکھوائیں گے اور اس کے بارے میں ہم میں کوئی اختلاف ہے ہی نہیں۔ کیونکہ اس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اظہار فرما دیا تھا کہ اے عائشہ! "ادعی لی أباک وأخاک" میرے پاس اپنے والد ابو بکر اور بھائی کو بلاؤ تاکہ میں انہیں ایک تحریر لکھ دوں کیونکہ مجھے خدشہ ہے کوئی تمنا کرنے والا تمنا کرے گا اور کہنے والا کہے گا میں زیادہ لائق اور حقدار ہوں اور اللہ تعالیٰ اور مومنین ابو بکر کے سوا کسی کو قبول نہیں کریں گے۔

نیز سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کا خیال تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی شدید بیمار ہیں، اس لیے آپ کو مزید تکلیف میں مبتلا نہیں کرنا چاہیے۔ پھر آپ نے بھی تحریر پر اصرار نہیں کیا۔

اگر لکھوانا ضروری ہوتا تو آپ کسی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے اور لکھوا کر رہتے جیسے صلح حدیبیہ سب کی مخالفت کے علی الرغم کفار کی شروط پر ہی کر لی تھی۔

نیز یہ واقعہ جمعرات کو پیش آیا اور آپ کی وفات سوموار کو ہوئی اگر تحریر ضروری ہوتی تو آپ نے ان دنوں اور وصیتیں کی ہیں بلکہ ہفتے کے دن منبر پر بیٹھ کر خطاب بھی فرمایا ہے۔

تو آپ ان دنوں میں لکھوا لیتے اور پھر عام طور پر مخاطب گھر کے افراد ہوتے ہیں تو سیدنا علی آگے پیچھے یہ کام کروا سکتے تھے بلکہ مسند احمد میں تو ہے کہ سیدنا علی بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ ایک طبق لے کر آؤ جس پر آپ ایسی چیز لکھوا دیں جس کے بعد آپ کی امت سرگرداں نہیں ہوگی۔

بہرحال سیدنا عمر نے یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور آپ کو تکلیف سے بچانے کے لیے کہی، آپ کے حکم کا انکار مقصود نہیں تھا۔

جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب قریش نے آپ کے نام کے ساتھ رسول اللہ لکھنے پر اعتراض کیا تو آپ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا یہ لفظ کاٹ کر محمد بن عبد اللہ لکھ دو تو سیدنا علی کہنے لگے ”واللہ لاأمحوک ابداً“ اللہ کی قسم میں کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ نہیں مٹاؤں گا۔تو یہ انکار تعظیم و محبت کی بنا پر تھا یا عناد و انکار کی خاطر؟۔

اس لیے اس واقعہ کو صحابہ کرام پر طعن و تشنیع کا ذریعہ بنانا صحابہ دشمنی کا شاخسانہ ہے وگرنہ اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی شرح مسلم میں رقم طراز ہیں۔

حدیث قرطاس کی بنا پر اہل تشیع کا مشہور اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ اور دوات لانے کا حکم دیا تھا اور سیدنا عمر اور ان کے موافقین نے کاغذ اور دوات نہ لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کی،اس کا الزامی جواب یہ ہے کہ اگر یہ بالفرض معصیت ہے تو اس میں سیدنا عمر اور ان کے موافقین منفرد نہیں بلکہ اس معصیت میں تمام اہل بیت (حاضرین مجلس) شریک ہیں۔

کیونکہ کاغذ اور دوات کسی نے لا کر نہیں دی، خاص طور پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول موجود ہے امام احمد روایت کرتے ہیں۔

”عن علي رضی اللہ عنہ بن أبي طالب قال أمرني النبي صلی اللہ علیہ وسلم أن آتیه بطبق یکتب فیه ما لا تضل أمته من بعدہٖ فخشیت أُن تفوتني نفسه قال قلت أنّی أحفظ وأعِي قال أوصیٰ بالصلاۃ والزکوٰۃ وما ملکت أیمانکم۔“[1]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں ایک طبق لے کر آؤں جس پر آپ ایسی چیز لکھ دیں گے جس کی وجہ سے آپ کی امت آپ کے بعد گمراہ نہیں ہو گی۔ سیدنا علی نے کہا مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں آپ فوت نہ ہو جائیں۔ میں نے کہا میں اس کو حفظ کر لوں گا اور یاد کر لوں گا!! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نماز، زکوٰۃ اور غلاموں اور باندیوں کے ساتھ (حسن سلوک) کی وصیت کرتا ہوں۔

[1] مسند احمد ، حدیث: 693

اس اعتراض کا دوسرا جواب یہ ہے کہ سید نا عمر اور ان کے موافقین کا دوات اور قلم نہ لا کر دینا کسی عناد اور معصیت کی بنا پر نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو درد سے شدید تکلیف ہو رہی ہے اور اس حالت میں لکھوانے سے کہیں آپ کو زیادہ تکلیف نہ ہو جائے اس لیے ان کا یہ کہنا تھا حسبنا کتاب الله، ہمیں کتاب اللہ کافی ہے۔

آپ سے شدید محبت اور آپ کو تکلیف کی شدت سے بچانے کے لیے تھا جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب کفار قریش نے صلح نامہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سید نا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاٹ کر محمد بن عبد اللہ لکھو دو تو سید نا علی نے فرمایا "لا والله لا أمحوك أبداً۔ "نہیں اللہ کی قسم میں آپ کا نام نہیں مٹاؤں گا۔

تو کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ سید نا علی رضی اللہ عنہ نے عناد اور معصیت کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم نہیں مانا؟ بلکہ ہر خردمند اور صاحب عقل شخص یہی کہے گا کہ سید نا علی رضی اللہ عنہ کا اس حکم کو نہ ماننا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور محبت کی بنا پر تھا۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ سید نا عمر رضی اللہ عنہ کا گمان یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک فوت نہیں ہوں گے جب تک تمام منافقین کو تہہ تیغ نہ کر لیں اور فارس و روم پر اسلام کے جھنڈے نہ گاڑ دیں اور ان کا خیال یہ بھی تھا کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں لکھا تو کوئی بات نہیں تندرست ہونے کے بعد لکھ دیں گے۔

اس توجیہ کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے امام ابن سعد اور واقدی روایت کرتے ہیں۔

عن ابن عباس أنّ النبى ﷺ قال في مرضه الذي مات فيه ائتوني بدواة وصحيفة أكتب لكم كتابا لن تضلوا بعده أبداً فقال عمر بن الخطاب:" من لفلانة وفلانة مدائن الروم، إن رسول اللهﷺ ليس بميت حتىٰ نفتحها"۔ [1]

"سید نا ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض وفات میں فرمایا مجھے دوات اور کاغذ لا کر دو میں تم کو ایسی چیز لکھ کر دوں گا جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے، سید نا عمر

[1] الطبقات الکبری 188/2

نے کہا، فلاں فلاں اور روم کے شہروں کا کیا ہو گا جب تک ہم ان شہروں کو فتح نہ کر لیں رسول اللہ ﷺ فوت نہیں ہوں گے۔‘‘

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ رسول اللہ ﷺ ابھی فوت نہیں ہوں گے، اس لیے جلدی کی کیا ضرورت ہے کہ اس شدید بیماری میں آپ کو لکھوانے کی زحمت دی جائے جیسا کہ اس باب کی حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ پر درد غالب ہے اور تمہارے پاس قرآن ہے ہمیں کتاب اللہ کافی ہے۔

اس اعتراض کا چوتھا جواب یہ ہے کہ کئی مواقع پر رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنی رائے پیش کرتے اگر وہ رائے صحیح ہوتی تو نبی علیہ السلام سیدنا عمر کے مشورے کو قبول فرما لیتے اور اگر غلط ہوتی تو رد فرما دیتے مثلاً صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ابوہریرۃ کو اپنی نعلین دے کر یہ اعلان کرنے کو کہا کہ جو شخص صمیم قلب سے لا الہ الا اللہ کی گواہی دے اس کو جنت کی بشارت دے دو۔ سیدنا عمر نے مشورہ دیا ’’فخلھم یعملون‘‘ لوگوں کو عمل کرنے دیں یعنی اس بشارت سے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر لوگ عمل کرنا نہ چھوڑ دیں اور رسول اللہ ﷺ نے اس رائے کو قبول فرما لیا۔

عبد اللہ بن اُبی ابن سلول کی نماز جنازہ پڑھنے سے سیدنا عمر نے بہت اختلاف کیا لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان کی رائے قبول نہیں فرمائی اور آپ نے عبد اللہ بن اُبی کی نماز جنازہ پڑھائی۔

صلح حدیبیہ کی شرائط سے عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بہت شدید اختلاف کیا لیکن رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عمر کے اختلاف کی طرف توجہ نہیں کی اور انہی شرائط پر صلح کی۔ اگر اس موقع پر بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی رائے غلط اور خطاء تھی تو رسول اللہ ﷺ اس کی تردید کرتے اور اتنے اہم امر کا لکھوانا نہ چھوڑتے جس پر مسلمانوں کے گمراہی سے بچنے کا مدار تھا۔ نبی کی بعثت ہی اس لیے ہوتی ہے کہ وہ ان باتوں کو بیان کرے جن پر گمراہی سے بچنا موقوف ہے اگر رسول اللہ ﷺ نے کسی ایسے امر کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے کی وجہ سے چھوڑ دیا تو یہ والعیاذ باللہ منصب نبوت و رسالت کے خلاف ہے۔

اس اعتراض کا پانچواں جواب یہ ہے کہ جن لوگوں نے دوات اور کاغذ لا کر نہیں دیا اس پر رسول اللہ ﷺ نے

کوئی عتاب نہیں کیا نہ انہیں کوئی سزا دی نہ ان کی تردید و تغلیط کی۔ البتہ اس میں بحث کرنے والوں سے فرمایا کہ میرے پاس سے اٹھ جاؤ نبی کے پاس بیٹھ کر بحث کرنا مناسب نہیں ہے جتنی بات غلط تھی بس اتنی غلطی پر ٹوک دیا۔ اگر قلم اور دوات نہ لا کر دینا بھی غلط تھا تو آپ اس پر بھی ٹوک دیتے۔

چھٹا جواب یہ ہے کہ نبی ﷺ جس چیز کو لکھوا رہے تھے اگر وہ مسلمانوں کے دین اور شریعت کی کوئی ضروری اور ناگزیر چیز تھی۔ تو نبی علیہ السلام اس کے لکھوانے کو کبھی ترک نہ کرتے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تو الگ رہے اگر ساری کائنات بھی مخالفت کرتی تب بھی آپ ﷺ اس کو ترک نہ کرتے۔

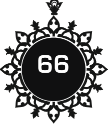




اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾ (المائدۃ: 67)

”اے رسول جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجیے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت ادا نہیں کی۔“



ساتواں جواب یہ ہے کہ نبی ﷺ اس واقعہ کے بعد چار دن زندہ رہے (کیونکہ یہ جمعرات کا واقعہ ہے اور پیر کو آپ ﷺ کا وصال ہوا ہے)



پس جس چیز کو آپ لکھوانے کے لیے کہہ رہے تھے اگر اس کا لکھوانا ضروری ہوتا تو ان دنوں میں لکھوا دیتے جبکہ ان ایام میں نبی ﷺ سے او رمتعدد احکامات ثابت ہیں اور بہت سے روایات میں ہے کہ ان ایام میں نبی ﷺ کے مرض میں تخفیف ہوگئی تھی اگر یہ کوئی ناگزیر چیز تھی تو آپ ﷺ ان ایام میں لکھوا دیتے۔



آٹھواں جواب یہ ہے کہ اگر یہ کوئی اہم چیز نہیں تھی اور واقعتاً ایسا ہی تھا جیسا کہ ہم بالدلائل بیان کر چکے ہیں تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر اعتراض کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک غیر اہم چیز کے لیے شدت مرض میں نبی ﷺ کو تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا۔

نواں جواب یہ ہے کہ نبی ﷺ نے پہلے امت پر شفقت کی خاطر یا کسی اور سبب سے کچھ لکھوانا چاہا بعد میں وحی کے ذریعے یا اجتہاد سے آپ پر یہ منکشف ہوا کہ اس چیز کا نہ لکھوانا ہی بہتر ہے۔

دسواں جواب یہ ہے کہ شریعت میں جو احکام آ چکے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کی تاکید کے طور پر کچھ لکھوانا چاہتے تھے اور جب سیدنا عمر نے کہا حسبنا کتاب اللہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاکید کی ضرورت نہیں سمجھی۔ [1]

آخری بات

حدیث قرطاس کو بطورِ ہتھیار طعن کے طور پر استعمال کرنے والوں سے سوال ہے کہ کیا آپ کے ہاں صحیح بخاری کی احادیث قابل اعتماد ہیں؟

اگر جواب نفی ہے تو پھر بات ہی ختم اعتراض پھر کیوں؟

ہمارے (جمیع اہل السنہ واصحاب الحدیث) کے ہاں یہ اصول پایا جاتا ہے کہ کسی بھی حدیث کو سمجھنے کے لیے اس باب کی اپنے موضوع کے متعلق تمام احادیث و روایات کو سامنے رکھا جائے پھر سیاق وسباق وقرائن، بیان موقع ومحل کے حساب سے منہج سلف کے مطابق اس کا معنی متعین کیا جائے (جیسا کہ ہم نے حسب استطاعت اس کے الفاظ کو جمع کیا ہے) تو اس طرح معنی وہ متعین ہوا جو ہم نے قدرِ بسط سے بیان کر دیا ہے۔

یہ واضح ہو گیا کہ

- ائتونی۔۔ بصیغہ جمع تمام حاضرین مجلس وحاضرین بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب تھے۔ فقط سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نہیں۔
- اور مسند احمد وغیرہ میں تو یہ صراحت موجود ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ خاص کر اس امر نبوی کے مخاطب تھے اور یہ عین قرین قیاس بھی ہے۔
- عدم تعمیل میں الزام (دیا گیا تو) سب کو دیا جائے گا نہ کہ فقط سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو۔
- اختلاف رائے، عدم تفہیم کلام پیغمبر اور شور وغل میں بھی بلا استثناء سب حاضرین داخل ہوئے نہ کہ فقط سیدنا عمر رضی اللہ عنہ۔

---

[1] شرح صحیح مسلم جلد 4

❁ بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم 4 ایام بقید حیات رہ کر بھی دوبارہ اس امر کو نہیں دہراتے تو لکھوائے جانے والا امر غیر ضروری قرار پاتا ہے۔

❁ اس واقعہ سے تو معلوم ہوا کہ امیر عمر رضی اللہ عنہ نے عین شرع کی موافقت کی ہے جیسا کہ اور مواقع پر اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں جن میں ایک آدھ ہم نے گزشتہ سطور میں ذکر بھی کر دی ہے۔

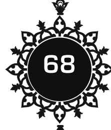


❁ واقعہ میں جس تحریر کا امکان تھا وہ خلافت تھی مگر صحیح مسلم کی ہماری ذکر کردہ روایت پکار کر کہہ رہی ہے وہ خلافت صدیق تھی نہ کہ اعدائے صحابہ کے مفروضے پر مبنی خلافت۔



❁ اور اگر ان کے مفروضے کی بات ہی رکھ لی جائے تو بتایا جائے کہ پھر 18 ذی الحجہ کو ''غدیر خم'' پر کیا اعلان ہوا تھا؟ اگر یہی امر مفروضہ تھا تو اب یہاں اس تکلیف پر مبنی محفل میں تکرار کیوں؟

❁ کیا خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ و دیگر اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم نے اس واقعہ قرطاس پر کبھی طعن کر کے خلافت کا دعویٰ کیا؟ کلاّ!



❁ یاد رہے بعض روایات میں جن میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ذکر ہے کہ وہ یہ کہتے ہوئے نکلے ''إن الرزية كل الرزية ۔۔۔۔'' تو اس سے مراد حجرۂ رسول نہیں بلکہ انہوں نے یہ بات عبید اللہ تابعی کے سامنے ذکر کی تھی بعد میں کبھی اور اس اپنی جگہ سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔



❁ ماشأنه، اهجر، استهموه، فذهبوا يردون عليه۔۔۔۔واوصاهم بثلاث۔۔۔۔ وغیرہ کے الفاظ بھی بلا استثناء تمام حاضرین مجلس نے ادا کئے تھے۔



❁ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا تھا ''قوموا عنی''، تو اس میں بھی تمام حاضرین مجلس مخاطب تھے کوئی مستثنیٰ نہیں نہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ



مگر حیرت ہے کہ دشمنان عمر رضی اللہ عنہ پر کہ انہیں ان روایات میں ''قم يا عمر رضى الله عنه'' بلا عینک ہی دکھائی دینے لگتا ہے اور ''قم يا على رضى الله عنه و يا عباس رضى الله عنه''قوموا عني'' کے الفاظ نبوی میں بمع عینک بھی دکھائی نہیں دیتا؟

﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾

بیت المقدس
تاریخ کے آئینے میں

عبد المجید محمد حسین بلتستانی[1]

بیت المقدس فلسطین کا شہر اور دار الحکومت ہے۔ یہ یہود، نصاریٰ اور مسلمان تینوں کے نزدیک مقدس جگہ ہے۔ بیت المقدس کو ''القدس'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ شروع اسلام میں یہ مسلمانوں کا قبلہ اول بھی تھا، پھر مدینہ منورہ ہجرت کے بعد نبی صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی شدید خواہش کے سبب اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کا حکم نازل فرما کر بیت اللہ کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا۔

مکہ مکرمہ سے بیت المقدس کا فاصلہ تقریباً 1300 کلومیٹر ہے۔ بیت اللحم اور الخلیل اس کے جنوب میں اور رام اللہ اس کے شمال میں واقع ہے۔

محل وقوع کے اعتبار سے فلسطین براعظم ایشیاء کے مغرب میں بحر متوسط کے جنوبی کنارے پر واقع ہے اس علاقے کو آج کل مشرق وسطیٰ بھی کہا جاتا ہے، فلسطین کے شمال میں جو علاقے لبنان اور شام کی سرحد سے ملتے ہیں یہ کوہستانی سلسلوں پر مشتمل ہے۔ اس کے مشرق میں بحرِ روم' شمال میں لبنان' شمال مشرق میں شام' مشرق میں اردن اور جنوب میں مصر واقع ہے۔ جبکہ مغرب میں بحر متوسط کا طویل ساحل ہے، فلسطین کا رقبہ تقریباً 27 ہزار کلومیٹر پر مشتمل ہے۔

فلسطین کے طبعی جغرافیائی علاقوں میں فلسطین کا طویل ساحل جو ناقورہ سے لے کر رفح تک جنوب میں پھیلا ہوا ہے سر فہرست ہے۔ جس کی چوڑائی 16 سے 18 کلومیٹر تک ہے۔ 1987ء کے اعداد و شمار کے مطابق فلسطینیوں کی تعداد پوری دنیا میں 51 لاکھ سے زیادہ ہے جو کہ مقبوضہ علاقوں کے علاوہ دنیا کے 13 مختلف ملکوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ فلسطین میں ''غزہ''، ''قدس''، ''السامرہ'' اور ''حیفا'' نامی

[1] ریسرچ اسکالر المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

چار صوبے میں جبکہ مشہور شہر ''بیت المقدس''، ''بیت اللحم''، ''رام اللہ''، ''غزہ''، ''نابلس''، ''حیفا''، ''یافا'' اور طولکرم ہیں۔

اسرائیل نے اپنا دارالحکومت بھی یافا کے شمال میں بنایا ہے، جبکہ پہاڑی سلسلوں میں نابلس، کرمل، خلیل اور القدس کے پہاڑی علاقے مشہور ہیں۔ علاوہ ازیں قدس کے پہاڑوں میں سب سے اونچا پہاڑ جبل طور ہے، جس میں بیت المقدس کا علاقہ واقع ہے، مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ بھی اسی شہر میں واقع ہیں۔ یہاں پہاڑی سلسلہ ہے جس میں ایک پہاڑی صیہون کہلاتی ہے، یہ قدس شہر کے جنوب مغرب میں واقع ہے جس میں مختلف قسم کی مذہبی اور تاریخی عمارتیں واقع ہیں جس پر مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ واقع ہیں۔

اسی صیہون پہاڑی کے نام پر ہی یہودیوں کی عالمی تحریک ''صیہونیت'' قائم کی گئی ہے، اس لفظ کا معنی ''خشک پہاڑی'' ہے۔

میدانی علاقوں میں نقب اور اغوار کے علاقے شامل ہیں، اغوار فلسطین کا مشرقی علاقہ ہے، جسے دریائے اُردن کاٹتا ہے اور بحر میت بھی اس کے کنارے واقع ہے، اس علاقے میں اریحا نامی شہر ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کا قدیم ترین شہر ہے۔

یہودیوں کی فلسطین کی طرف ہجرت

تقریباً 300 سال قبل از مسیح بنی اسرائیل سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلے اور شام کے راستہ سے سرزمین قدس کی جانب چل پڑے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ بیت المقدس میں داخل ہو جائیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ﴾ (المائدۃ:21)

ترجمہ: ''اے میری قوم! اس ارضِ مقدس میں داخل ہو جاؤ جسے اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے اور میدان سے الٹے پاؤں نہ پلٹ جاؤ کہ خسارہ والوں میں سے ہو جاؤ گے''۔

لیکن بنی اسرائیل نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے حکم سے روگردانی اختیار کی اس لیے کہ وہ لوگ ایک

''عمالقہ'' سے الجھنا اور جنگ نہیں چاہتے تھے جو کہ اس سرزمین پر رہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے سیدنا موسیٰ اور ہارون علیہم السلام سے بڑے گستاخانہ انداز میں کہا:

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾(المائدۃ:24)

'ان لوگوں نے کہا کہ موسیٰ! ہم ہرگز وہاں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ لوگ وہاں ہیں۔ آپ اپنے پروردگار کے ساتھ جا کر جنگ کیجیے ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔''

ان کے اس گستاخانہ رویے کی وجہ سے چالیس سال تک اس شہر میں ان لوگوں کا داخلہ حرام ہو گیا چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ﴾(المائدۃ:26)

'' ارشاد ہوا کہ اب زمین ان پر چالیس سال تک حرام کر دی گئی ہے، یہ خانہ بدوش ادھر ادھر سرگرداں پھرتے رہیں گے اس لئے تم ان فاسقوں کے بارے میں غمگین نہ ہونا''۔

جب سیدنا موسیٰ اور سیدنا ہارون علیہما السلام وفات پا گئے اور ان کے بعد ان کی قوم 40 سال تک تیہ کے بیابان میں سرگرداں رہی۔ اس دوران پرانے لوگوں کی بھی وفات ہو گئی اور ان کی جگہ ان کی اولادیں آ گئیں جن کی قیادت یوشع بن نون کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے نئی نسل کو بیت المقدس میں داخل ہونے پر آمادہ کیا۔ مقدس سرزمین میں داخل ہوتے وقت ''اریحا'' کے مقام پر ''عمالقہ'' کے ساتھ ان کی جھڑپ ہوئی اور ان کو شکست دینے کے بعد وہ لوگ ''قدس'' کی سرزمین میں داخل ہو گئے۔ [1]

بیت المقدس کے فضائل

بیت المقدس میں موجود مسجد جسے مسجد اقصیٰ کہا جاتا ہے اس کے بہت سے فضائل احادیث میں مذکور ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر، بہ حوالہ تفسیر احسن البیان، ص:295(طبع مجمع ملک فہد سعودی عرب)

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ﴾(بنی اسرائیل:1)

"وہ پاک ہے جس نے راتوں رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی جس کے ارد گرد ہم نے برکت رکھی ہے۔"

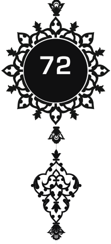


نبی ﷺ نے جن تین مساجد کا ذکر فرمایا ہے کہ ان کی طرف سفر کی نیت سے انسان جا سکتا ہے ان میں سے ایک مسجد اقصیٰ ہے۔[1]



مسجد حرام کے بعد جو مسجد تعمیر ہوئی وہ مسجد اقصیٰ ہے۔[2]

نبی ﷺ کو یہیں بیت المقدس سے معراج کا سفر کروایا گیا،[3]



سرزمین بیت المقدس محشر (جمع ہونے) اور منشر (دوبارہ زندہ ہونے) کا مقام ہے، حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ کی خادمہ میمونہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا کہ ہمیں بیت المقدس کے بارے میں آگاہ کیجیے تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ جمع ہونے اور زندہ ہونے کا مقام ہے۔[4]

قدیم تاریخ



سب سے پہلے سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے برادرزادے سیدنا لوط علیہ السلام نے عراق سے بیت المقدس کی طرف ہجرت کی تھی۔ 620ء میں نبی کریم ﷺ جبریل امین علیہ السلام کی رہنمائی میں مکہ سے بیت المقدس پہنچے اور پھر معراج آسمانی کے لیے تشریف لے گئے۔

سیدنا یعقوب علیہ السلام نے وحی الٰہی کے مطابق مسجد بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) کی بنیاد ڈالی اور اس کی وجہ سے بیت المقدس آباد ہوا۔ پھر لمبی مدت کے بعد سیدنا سلیمان علیہ السلام (961 ق م) کے حکم سے

---

[1] صحیح بخاری:1188، صحیح مسلم:1397

[2] صحیح بخاری:3366، صحیح مسلم:520

[3] صحیح مسلم:162

[4] سنن ابن ماجه:1407

مسجد اور شہر کو دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ اس لیے یہودی مسجد اقصیٰ کو ہیکل سلیمانی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔
ہیکل سلیمانی اور بیت المقدس کو 586 ق م میں شاہ بابل (عراق) بخت نصر نے گرادیا تھا اور لاکھوں یہودیوں کو اپنا غلام بنا کر قید کر کے اپنے ساتھ عراق لے گیا۔ بیت المقدس کی اس بربادی کے وقت سیدنا عزیر علیہ السلام کا وہاں سے گزر ہوا، اور اس عظیم تباہی و بربادی پر انہیں سخت حیرت ہوئی اور تعجب کا اظہار کیا کہ کیا یہ اجڑا شہر دوبارہ کیسے آباد ہو پائے گا؟! تو اللہ تعالیٰ انہیں وہیں پر موت دے دی جب سو سال بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندہ کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ شہر دوبارہ آباد ہو کر پُر رونق بن چکا تھا۔ [1]



بخت نصر کے بعد 539 ق م میں شہنشاہ فارس روش کبیر (سائرس اعظم) نے بابل فتح کر کے بنی اسرائیل کو فلسطین واپس جانے کی اجازت دے دی۔ یہودی حکمران ہیرو داعظم کے زمانے میں یہودیوں نے بیت المقدس شہر اور ہیکل سلیمانی پھر تعمیر کر لیے۔ یروشلم پر دوسری تباہی رومیوں کے دور میں نازل ہوئی۔ رومی جرنیل ٹائٹس نے یروشلم اور ہیکل سلیمانی دونوں مسمار کر دیے۔

137 ق م میں رومی شہنشاہ ہیڈرین نے خود سر یہودیوں کو بیت المقدس اور فلسطین سے جلاوطن کر دیا۔
چوتھی صدی عیسوی میں رومیوں نے عیسائیت قبول کر لی اور بیت المقدس میں گرجے تعمیر کیے۔
نبی کریم ﷺ معراج کو جاتے ہوئے بیت المقدس پہنچے، 2ھ تک بیت المقدس ہی مسلمانوں کا قبلہ تھا، حتی کہ حکم الٰہی کے مطابق کعبہ (مکہ مکرمہ میں کبعۃ اللہ) کو قبلہ قرار دیا گیا۔

17ھ میں عہد فاروقی میں عیسائیوں سے ایک معاہدے کے تحت بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔
خلیفہ عبد الملک کے عہد میں یہاں مسجد اقصیٰ کی تعمیر عمل میں آئی اور صخرہ معراج پر قبۃ الصخرہ بنایا گیا۔
1099ء میں پہلی صلیبی جنگ کے موقع پر یورپی صلیبیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے 70 ہزار مسلمانوں کو شہید کر دیا۔

1187ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو عیسائیوں کے قبضے سے چھڑایا۔

جدید تاریخ اور یہودی قبضہ

پہلی جنگ عظیم دسمبر 1917ء کے دوران انگریزوں نے بیت المقدس اور فلسطین پر قبضہ کر کے یہودیوں کو

[1] جامع البیان، 20/3، از امام ابن جریر رحمہ اللہ۔

آباد ہونے کی عام اجازت دے دی۔ یہود و نصاریٰ کی سازش کے تحت نومبر 1947ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے دھاندلی سے کام لیتے ہوئے فلسطین کو عربوں اور یہودیوں میں تقسیم کر دیا اور جب 14 مئی 1948ء کو یہودیوں نے اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا تو پہلی عرب اسرائیل جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ کے نتیجے میں اسرائیلی فلسطین کے 78 فیصد رقبے پر قابض ہو گئے، تاہم مشرقی یروشلم (بیت المقدس) اور غرب اردن کے علاقے اردن کے قبضے میں آ گئے۔ تیسری عرب اسرائیل جنگ (جون 1967ء) میں اسرائیلیوں نے بقیہ فلسطین اور بیت المقدس پر بھی تسلط جما لیا۔ یوں مسلمانوں کا قبلہ اول ہنوز یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ یہودیوں کے بقول ہیکل سلیمانی کی ایک دیوار کا کچھ حصہ بچا ہوا ہے جہاں یہودی زائرین آ کر رویا کرتے ہیں اسی لیے اسے ''دیوار گریہ'' کہا جاتا ہے، یہ دیوار بیت المقدس کے مغربی دیوار میں پچاس فٹ ٹکڑے کے بارے میں یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ ہیکل سلیمانی کی باقیات میں سے ہے چنانچہ وہ اس مقام پر آ کر اپنا رونا دھونا کرتے ہیں، اسی نسبت سے اس کا نام ''دیوار گریہ'' پڑ گیا۔ اب یہودی مسجد اقصیٰ کو گرا کر ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔







اس دیوار کے بارے میں ''تاریخ بیت المقدس'' کے مصنف جناب لیاقت ممتاز صاحب نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے جو کہ کتاب کے صفحہ 168 سے لے کر 197 تک پھیلا ہوا ہے۔

مسجد اقصیٰ کا قصہ



مسجد اقصیٰ مسلمانوں کا قبلہ اول اور خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کے بعد تیسرا مقدس ترین مقام ہے۔ مقامی مسلمان اسے المسجد الاقصیٰ یا الحرم القدسی الشریف کہتے ہیں۔ یہ مشرقی یروشلم میں واقع ہے جس پر اسرائیل کا قبضہ ہے۔ یہ یروشلم کی سب سے بڑی مسجد شمار کی جاتی ہے جس میں 5 ہزار نمازیوں کی گنجائش ہے جبکہ مسجد کے صحن میں بھی اس قدر وسعت ہے کہ یہاں بھی ہزاروں افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔

نبی ﷺ سفر معراج کے دوران مسجد حرام سے یہاں پہنچے تھے اور مسجد اقصیٰ میں تمام انبیاء کی نماز کی امامت کرنے کے بعد براق کے ذریعے سات آسمانوں کے سفر پر روانہ ہوئے۔

مسجد اقصیٰ کی پیمائش سے متعلق مختلف اقوال ہیں، احسن التقاسیم کے موقف کے مطابق مسجد اقصیٰ کی لمبائی

1 ہزار گز اور چوڑائی 700 گز ہے، جبکہ صاحب معجم البلدان کا کہنا ہے کہ اس کی لمبائی اس کی چوڑائی سے زیادہ ہے۔ ''تاریخ بیت المقدس'' کے مؤلف بھی ابن الفقیہ کے حوالے سے یہی لکھتے ہیں کہ ''حرم شریف کا طول 1 ہزار درع اور عرض 700 درع ہے''[1] آگے مزید لکھتے ہیں: ''ایک جدید ترین سفر نامہ کے مطابق حرم مقدس کی لمبائی 1200 گز اور چوڑائی 660 گز ہے''۔[2]

ناصر خسرو نے اپنے سفرنامے میں جو 438ھ میں اس نے کیا تھا، اس میں لکھا ہے کہ مسجد بیت المقدس کی لمبائی 754 گز اور چوڑائی 455 گز ہے، یہ خراسان وغیرہ کے گز کے حساب سے ہے۔ ابن جبیر نے اپنے سفر نامہ میں جو 578ھ - 581ھ میں بیت المقدس کیا گیا، اس میں لکھا ہے کہ مسجد اقصیٰ کی 780 گز لمبائی اور 450 گز چوڑائی ہے اور حدود حرم کے اندرونی ہال کا طول 600 گز اور عرض 700 گز ہے، نہایت عمدہ اور خوبصورت نقش ونگار کیا ہوا ہے۔ تمام مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مسجد اقصیٰ روز اول سے جن حدود پر قائم ہوئی، آج بھی انہیں حدود پر قائم ہے۔ کبھی چار دیواری کے اندر پورے احاطے کو مسجد اقصیٰ کہا جاتا ہے اور کبھی صرف اس خاص حصہ کو مسجد اقصیٰ کہا جاتا ہے۔

مسجد کے اندرونی حصے میں مغرب کی جانب جامع النساء ہے، جس کو فاطمیوں نے تعمیر کروایا تھا اور اسی طرف جامع عمر بھی ہے، جس کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فتح کے بعد تعمیر کرایا تھا اور اسی عمارت کی طرف ایک بڑا خوبصورت ایوان ہے، جس کو ''مقامِ عزیر'' سے موسوم کیا گیا ہے، اسی ایوان کے شمال میں ایک خوبصورت محراب ہے، جو کہ ''محرابِ زکریا'' کہلاتا ہے اس کی لمبائی اور چوڑائی 606 میٹر ہے۔ مغرب کی جانب ایک لوہے کا جنگلہ ہے، جس میں ایک محراب ''محرابِ معاویہ'' کے نام سے ہے۔ قبلہ کی جانب ایک بڑا محراب ہے، جس کو محرابِ داؤد کہتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک منبر ہے، یہ منبر سلطان نور الدین زنگی نے مسجد اقصیٰ کے لیے بنوایا تھا، خود انتقال کر گئے، لیکن ان کے جانشین سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس کو فتح کے بعد حلب سے منگوا کر نصب کیا۔[3]

---

[1] تاریخ بیت المقدس، صفحہ: 114

[2] ایضاً، صفحہ: 115

[3] البدایہ والنہایۃ 347/12، خطط الشام، 255/5

مسجد اقصیٰ مسلمانوں کا قبلہ اُول ہے اور معراج کے وقت نماز کی فرضیت سے 16 سے 17 ماہ تک مسلمان مسجد اقصیٰ کی جانب رخ کر کے ہی نماز ادا کرتے تھے پھر تحویل قبلہ کا حکم آنے کے بعد مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ ہو گیا۔

مسلمانوں کی تعمیرات کا دور

جب سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ کسی یہودی کو بیت المقدس میں رہنے کا حق نہیں ہو گا۔ اس کے مقابلے میں وہاں کے عیسائیوں نے جزیہ دینا قبول کیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے شہر سے روانگی کے وقت صخرہ اور براق باندھنے کی جگہ کے قریب مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا جہاں انہوں نے اپنے ہمراہیوں سمیت نماز ادا کی تھی۔ یہی مسجد بعد میں مسجد اقصیٰ کہلائی کیونکہ قرآن مجید کی سورہ بنی اسرائیل کے آغاز میں اس مقام کو مسجد اقصیٰ کہا گیا ہے۔ اس دور میں بہت سے صحابہ نے تبلیغ اسلام اور اشاعت دین کی خاطر بیت المقدس میں اقامت اختیار کی۔ اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان نے مسجد اقصیٰ کی از سر نو تعمیر شروع کرائی اور ان کے بیٹے خلیفہ ولید بن عبد الملک نے اس کی تعمیر مکمل کروائی اور اس کی تزئین و آرائش بھی کروائی۔ عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے بھی اس مسجد کی مرمت کروائی۔ پہلی صلیبی جنگ کے بعد جب بیت المقدس عیسائیوں کے قبضے میں آیا تو انہوں نے مسجد اقصیٰ میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔ انہوں نے مسجد میں رہنے کے لیے کئی کمرے بنا لیے اور اس کا نام معبد سلیمان رکھا، نیز متعدد دیگر عمارتوں کا اضافہ کیا جو بطور جائے ضرورت اور اناج کی کوٹھیوں کے استعمال ہوتی تھیں۔ انہوں نے مسجد کے اندر اور مسجد کے ساتھ ساتھ گرجا بھی بنا لیا، بعد میں جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے 1187ء میں فتح بیت المقدس کو فتح کیا تو مسجد اقصیٰ سے عیسائیوں کے تمام نشانات کو مٹا کر اسے پاک کیا اور مسجد کے محراب اور مسجد کی از سر نو تعمیر کروائی۔

مسجد اقصیٰ اس ساری مسجد کا نام ہے جسے سیدنا سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا، اور بعض لوگ اس مصلی یعنی نماز پڑھنے کی جگہ کو جسے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ تعالی عنہ نے اس کی اگلی جانب تعمیر کیا تھا اقصی کا نام دینے لگے ہیں، اس جگہ میں جسے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ تعالی عنہ نے تعمیر کیا تھا نماز پڑھنا باقی

ساری مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔"

بعض لوگ تصاویر میں نظر آنے والے سنہری رنگ کے گنبد کو مسجد اقصیٰ سمجھتے ہیں، جبکہ وہ مسجد اقصیٰ نہیں بلکہ وہ تو قبۃ الصخرہ کے اوپر کا گنبد ہے جسے اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان کے حکم پر 70ھ میں تعمیر کیا گیا۔

اس صخرہ (گنبد) کے حوالے سے جناب لیاقت ممتاز صاحب لکھتے ہیں: "صخرہ کا قطر 20،44 میٹر ہے اور یہ 31 میٹر بلند ہے بیت المقدس میں اس سے اونچی عمارت کوئی نہیں، یہ شہر کے ہر حصہ اور بیرون شہر سے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے، قدس کا مسافر جدھر سے بھی آتا اس کی نظر سب سے پہلے اس گنبد پر پڑتی ہے"۔[1]

یہ قبۃ الصخرۃ آٹھ پہلوؤں والا ہے، آٹھ پہلوؤں میں سے ہر پہلو 33 گز کا ہے اور چاروں طرف دروازے ہیں اور قبہ کا اندرونی احاطہ 53 میٹر ہے، سیڑھیوں سے چڑھ کر اوپر کی طرف پہنچتے ہیں، سیڑھیوں کے اختتام پر دروازے ہیں اور قبہ کا اندرونی حصہ تین حصوں پر مشتمل ہے: پہلے میں چٹان، دوسرے میں ستون اور تیسرا حصہ دروازے کے ساتھ متصل ہے۔

قبہ میں اندر کی طرف ستون کی دو قطاریں ہیں۔ پہلی قطار چٹان کے ارد گرد ہے، اس میں چار بڑے چار پہلوؤں والے اور دو گول چھوٹے ستون ہیں۔ دوسری قطار ذرا فاصلہ پر ہے، اس میں آٹھ بڑے چھ پہلوؤں والے 16 چھوٹے ستون ہیں اور ان ستونوں پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے۔[2]

سانحہ بیت المقدس 21 اگست 1969ء کو ایک آسٹریلوی یہودی ڈینس مائیکل روحان نے قبلہ اول کو آگ لگادی جس سے مسجد اقصیٰ کئی گھنٹوں تک آگ کی لپیٹ میں رہی اور جنوب مشرقی جانب عین قبلہ کی طرف کا بڑا حصہ گر پڑا۔ محراب میں موجود منبر بھی نذر آتش ہو گیا جسے فاتح قدس صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے فتح بیت المقدس کے بعد نصب کیا تھا۔۔ صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے قبلہ اوّل کی آزادی کے لیے تقریباً 16 جنگیں لڑیں اور ہر جنگ کے دوران وہ منبر ان کے ہمراہ ہوتا کہ جب بیت المقدس فتح ہو تو

[1] تاریخ بیت المقدس، صفحہ: 174۔

[2] تاریخ یعقوبی 182/2۔، تاریخ بیت المقدس، ص: 152۔

اسے وہاں نصب کر دیا جائے۔

یہودی سمجھتے ہیں کہ یہ مسجد ہیکل سلیمانی کی جگہ پر بنائی گئی ہے، اس لیے وہ اس مسجد کو گرا کر ہیکل سلیمانی کو اس جگہ تعمیر کی خواہش رکھتے ہیں، جبکہ ان کا یہ دعویٰ کہ یہ مسجد ہیکل سلیمانی کی جگہ بنائی گئی ہے بالکل بے بنیاد ہے۔



فلسطین کی اہمیت اسلام اور مسلمانوں کے لیے اس حوالے سے بہت واضح رہی ہے کہ ابتدائے اسلام میں یہ ان کا قبلہ اوّل رہا ہے، اسی وجہ سے رومیوں کے ساتھ معرکے جناب نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ ہی میں شروع ہو گئے تھے۔ نبی ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنا آخری لشکر جیش اسامہ رومیوں کے مقابلے کے لیے ترتیب دیا تھا ابھی وہ لشکر مدینہ کی حدود سے باہر نہ نکلا تھا کہ آپ ﷺ، اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر ہو گئے آپ کے بعد سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے روانہ فرمایا، ارتداد کی مہم سے فارغ ہو کر خود بھی اس جانب توجہ دی۔ یہاں تک کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔







چھٹی صدی ہجری میں بلاد اسلامیہ پر صلیبیوں نے حملہ کیا، جس کے نتیجے میں فلسطین میں صلیبی حکومت قائم کر لی گئی، طاقت اور قوت کے بل بوتے پر 70 ہزار مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا، لیکن صلیبیوں کی یہ حکومت دیر پا ثابت نہ ہو سکی مشہور مجاہد صلاح الدین ایوبی نے جلد ہی بیت المقدس کو صلیبی پنجہ استبداد سے آزاد کرایا، 27 رجب 538ھ کو بیت المقدس دوبارہ تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھا۔



جس وقت عالم اسلام کو استعماری طاقتوں نے اپنی سازشوں کا ہدف بنایا اور فلسطین کی سرزمین برطانیہ کے استعماری قبضہ میں آنے لگی تو مکار اور شاطر یہودیوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اس خطے کے حصول کی خاطر کوششیں تیز کر دیں 1839ء میں سب سے پہلا مغربی سفارتخانہ جو بیت المقدس میں کھلا وہ حکومت برطانیہ کا تھا، جس کا واحد مقصد یہودیوں کی خدمت گزاری تھا، اس کے ساتھ ہی پوری دنیا سے یہودیوں کو بیت المقدس میں جمع کرنا شروع کر دیا گیا، اس وقت پورے فلسطین میں صرف 9 ہزار کے قریب یہودی تھے۔

1895ء میں ایک یہودی مفکر ’’النمساوی ہیر تسل‘‘ نے ایک کتاب شائع کی جس کا عنوان تھا ’’یہودی مملکت‘‘ جس میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ یہودی قوم کو ایک حکومت کی ضرورت ہے، اس مقصد کے لیے فلسطین سے بہتر کوئی جگہ ان کی نظر میں نہ تھی۔ اس دور میں یہودیوں کی عالمی سطح پر دو بڑی کانفرنسیں ہوئیں، پہلی کانفرنس 1897ء اور دوسری 1898ء میں، جن کا حاصل یہ تھا کہ یہود اپنے قدیم وطن فلسطین کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے منظم ہو جائیں، چونکہ فلسطین خلافت عثمانیہ کا ایک حصہ تھا اور وہی اس کے مالک و متصرف تھی، اس کے مقابلے کے لیے قوم یہود نے ہر طرح کے حربے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔



خلافت عثمانیہ کے آخری خلیفہ سلطان عبد الحمید کو اپنے دام تزویر میں پھنسانے کے لیے انھوں نے مختلف سطحوں پر سازباز شروع کی، جس میں بھاری رقوم دے کر ترکوں کو خرید اگیا، خود خلیفہ عبد الحمید کو لالچ دیئے گئے یہاں تک کہ ایک دفعہ ترکی کے یہودیوں کا ایک وفد سلطان سے ملا اور ان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ فلسطین اگر یہودیوں کو دے دیا جائے تو اس کے بدلے ہم خلافت عثمانیہ کے ماتحت رہ کر خلافت کے سارے قرضے اتار دیں گے، جواب میں سلطان نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کر ان کو دکھایا پھر فرمایا ’’اگر فلسطین کا اتنا حصہ بھی تم لینا چاہو گے تو نہیں ملے گا‘‘، اس حوالے سے جناب لیاقت ممتاز مزید لکھتے ہیں کہ سلطان نے اس یہودی وفد کو یہ جواب دیا: ’’اگر یہودی اپنی ساری دولت بھی میرے قدموں میں لا ڈالیں، تب بھی میں فلسطین میں مسلمانوں کی ایک انچ زمین یہودیوں کو دینے کا روادار نہیں‘‘۔[1]









سلطان عبد الحمید سے مایوس ہو کر اللہ کے غضب کی ماری اس قوم نے ان کی شہرت عام کو بگاڑنے کی کوشش شروع کر دی، چونکہ ذرائع ابلاغ پر یہودیوں کی اجارہ داری تھی اس لیے اس ہتھیار سے کام لے کر سلطان پر ’’رجعت پسند یا ورنسل پرست‘‘ جیسے بے پر کے الزامات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا، نتیجتاً خلافت عثمانیہ میں قومی نعروں کو پروان ملی۔

1909ء سلطان عبد الحمید کا انتقال ہوا تو گویا اس دن سے اسرائیل کے وجود کی بنیاد پڑ گئی، حکومت میں

---

[1] تاریخ بیت المقدس، صفحہ: 242۔

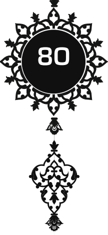
موجود صہیونیت نواز لوگوں کا ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو برابر یہودیوں کو فلسطین منتقل کرنے میں مدد دیتا رہا، یہاں تک کہ 1897ء میں ان کی تعداد پچاس ہزار تھی اور یہی تعداد 1914ء میں پچاسی ہزار ہو گئی۔

یہود ایک مالدار قوم ہے، ہر ملک میں بڑے بڑے بیوپاریوں اور ساہوکاروں کی صورت میں موجود ہیں، جس کی وجہ سے ملکوں کی سیاست اور معاملات پر ان کا اثر انداز ہونا کوئی تعجب خیز امر نہیں، دنیا کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے انھوں نے کچھ "پروٹوکول" تسخیر عالم کا صہیونی منصوبہ تشکیل دیا ہے یہ خفیہ دستاویز 1906ء کے پس وپیش منظر عام پر آئی۔ اس دستاویز کا اردو ترجمہ محمد یحییٰ خان نے کیا ہے جو کہ چھپ چکا ہے۔





ان یہودیوں نے خلافتِ عثمانیہ کو ہر طرح اور ہر سطح پر دباؤ میں رکھنے کی کوشش کی، اور دنیا کو باور کرایا کہ فلسطین کا حصول یہودیوں کے لیے ناگزیر ہے، لیکن خلافت عثمانیہ ان کے باطل عزائم اور ارادوں کے سامنے سدسکندری ثابت ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس بے حقیقت مفروضے کی بنیاد پر حکومت مصر کے توسط سے صحراء سینا میں یہودیوں کو بسانے کی ایک مرتبہ کوشش بھی کی گئی، جس میں وہ ناکام ہوئے۔ اس کے بعد دنیا کی سیاست میں کچھ ایسے حالات آئے جو فلسطین میں بدی کی "نمائندہ قوم" کے لیے قیام حکومت کی راہ ہموار کرتے چلے گئے، جن میں چار حالات کا بطور خاص ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے:



(1) دو عالمی جنگوں کا وقوع پذیر ہونا۔

(2) ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں کا قتل عام جس سے وہ دنیا کو اپنی مظلومیت ثابت کر پائے۔

(3) خلافت عثمانیہ کا سقوط۔

(4) فلسطین کا برطانوی استعمار کے زیر دست ہو جانا۔



اس تیسرے نکتے کی وجہ سے برطانیہ نے یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے کے لیے ہر لحاظ سے تعاون کیا۔ مقامی باشندوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کیا گیا، یہودی بستیاں آباد کی گئیں، تل ابیب کو مضبوط کیا، یہودیوں کے استحکام سے مطمئن ہو کر خود 14 مئی 1948ء کو فلسطین سے نکلنے کا اعلان کیا، جاتے جاتے اہم مقامات، سرکاری دفاتر، ہوائی اڈے یہودیوں کو بطور بخشش دیے گئے، جبکہ مسلمانوں کا جانی، مالی اور

اقتصادی استحصال کیا گیا، جس کے نتیجے میں کچھ قتل ہوئے اور اکثر ہجرت پر مجبور ہوئے۔

15 مئی 1948ء کو اسرائیلی مملکت کا اعلانِ قیام ہوا، جسے چند ہی لمحوں میں امریکہ، روس اور یورپ نے تسلیم کرلیا، اسلامی ممالک میں سے صرف ترکی اور اس وقت کے شاہ ایران نے یہ ناجائز ریاست تسلیم کر کے اپنے فکری ضلالت پر مہر تصدیق ثبت کی۔

اس وقت بیت المقدس پر اسرائیلی غاصبوں کے تسلط کو 1948ء سے لے کر اب تک ستر سال سے زائد ہو چکے ہیں، ان ستر سالوں میں یہ بیت المقدس کے تقدس کو پامال کرنے میں لگے ہوئے ہیں، اب بھی اس کے انہدام کی ناکام کوششیں جاری ہیں۔

اس تسلط کا یہودی وصہیونی مقصد ان کے اس درینہ خواب ''گریٹر اسرائیل'' کی تعبیر ہے جس کا یہ نعرہ لگاتے ہیں ''اسرائیل کی حدود فرات سے نیل تک ہے''۔ اپنے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے یہ فلسطین پر ناجائز قبضہ کر رہے ہیں، اس وقت بھی یہودی غاصب فلسطین میں فلسطینیوں کی زمینوں کو غصب کر رہے ہیں، ان کے گھروں کو گرایا جار ہا ہے۔

اللہ تعالیٰ بیت المقدس کی حفاظت فرمائے، اسے صہیونی غاصبوں سے آزاد فرمائے، اور اہل فلسطین کی مدد فرمائے۔ اور ان غاصبوں کو تباہ و برباد فرمائے آمین۔



آہ! مولانا رفیق اثری (رحمہ اللہ) في ذمة الله

گزشتہ دنوں استاذ الاساتذہ شیخ الحدیث مولانا رفیق اثری رحمہ اللہ کی وفات کی خبر تمام اہل اسلام پر بالعموم اور مسلک اہل حدیث پر بالخصوص بجلی بن کر گری۔ جماعت اہلحدیث کا سرمایہ افتخار عظیم محدث، نصف صدی سے زائد عرصہ حدیثِ رسول ﷺ کی درس و تدریس میں گزارنے والے اس مردِ مجاہد کی وفات حق رکھتی ہے کہ ان کے بارے میں یہ الفاظ کہے جائیں جو امام حسن بصری رحمہ اللہ نے عالم دین کی موت کی بابت کہے تھے کہ

"موت العالم ثلمة في الاسلام لا يسده شئ ما اختلف الليل والنهار۔"

" عالم دین کی موت سے اسلام میں ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے کہ جب تک لیل و نہار باقی ہیں اسے کوئی چیز پُر نہیں کرسکتی۔"

اور جیسا کہ ایوب السختیانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"إنى أخبر لموت الرجل من أهل السنة،وكأني أفقد احد أعضائي"

"مجھے جب اہل سنت میں کسی کی موت کی خبر ملتی ہے تو (ایسا محسوس ہوتا ہے کہ) گویا میرے جسم کا ایک عضو کٹ گیا ہو۔"

مولانا رفیق اثری کی وفات ہر اہل حدیث کے لیے ایسے ہی تھی کہ گویا ہمارے جسم کا کوئی عضو کٹ گیا ہو، آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی خدمت کا بہت موقع عنایت فرمایا جو کہ رب تعالیٰ کی ان سے رضا کی علامت ہے۔

" غفره الله له وأدخله فسيح جناته۔"

آپ رحمہ اللہ کی ادارہ المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر سے بھی کچھ یادیں وابستہ ہیں، سنہ 2020 میں بروز جمعرات ماہ اگست میں المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کا ایک بڑا وفد (بشمول رئیس و مدیر المرکز)

آپ سے ملاقات کے لیے جلال پور پیر والا آپ کے ادارہ میں حاضر ہوا۔ شیخ رحمہ اللہ اور آپ کے فرزند ارجمند شیخ اسامہ رفیق حفظہ اللہ نے خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، انواع واقسام کے کھانوں سے تواضع کی، ایک پر تکلف دعوت کے ساتھ آپ سے علمی نشست بھی بہت ہی مفید رہی، مختصر سی مجلس میں ہم نے بہت کچھ حاصل کیا، آپ کا مشن یہ تھا کہ درسی نسخوں پر اہلحدیث علماء کے حواشی چھپنے چاہئیں ہمارے ادارے کا بھی ایک پروجیکٹ اس کام کیلئے مخصوص ہے ہم نے اسی حوالے سے شیخ محترم سے مشاورت کی آپ نے بہت ہی مفید مشورے دیے اور موطاامام مالک پر اپنے حواشی کا قدیم نسخہ دیا جس کی ادارے نے ذمہ داری اٹھائی کہ اس کی ترتیب وڈیزائننگ اس کے شایان شان بنا کر شیخ محترم کو دیں گے اور اسے طبع بھی کرائیں گے۔ جس پر بڑی حد تک کام مکمل ہو چکا ہے وللہ الحمد۔

کوشش بہت تھی کہ آپ کی حیات میں ہی سارا کام مکمل ہو جائے لیکن اجل نے اجازت نہ دی (قدر الله وماشاء فعل) آپ سے ملاقاتوں اور حاصل ہونے والے علمی فوائد کے حوالے سے بھی انشاءاللہ تفصیلاً لکھیں گے البتہ "مالایدرك كله، لا يترك جلّه" کے قاعدے کے تحت آپ کی حیات ووفات سے متعلق دو مضامین یہاں نشر کیے جا رہے ہیں ایک مضمون مؤرخ اہل حدیث مولانا اسحاق بھٹی صاحب رحمہ اللہ کی کتاب " دبستان حدیث " سے لیا گیا ہے۔ اور دوسرا برادر مکرم عمر فاروق بن مظفر اقبال فاضل مرکز العلوم الاسلامیہ ستیانہ بنگلہ کا انٹرویو ہے۔ جو کہ تعارفی ہونے کے ساتھ انتہائی علمی بھی ہے وہ یہاں شائع کیا جا رہا ہے اللہ تعالیٰ ہمارے شیخ کو فردوس اعلیٰ میں جگہ عنایت کرے اور ان کی تمام کاوشوں کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

انه ولی التوفیق

(ادارہ)

شیخ الحدیث مولانا محمد رفیق اثری رحمہ اللہ

مولانا اسحاق بھٹی رحمہ اللہ [1]

مولانا محمد رفیق اثری 1937ء میں سنگرور (مشرقی پنجاب) کے ایک قصبے ''رشیداں والا'' میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی میاں قائم الدین تھا جو عامل بالحدیث تھے۔ تقسیم ملک کے زمانے میں یہ لوگ براستہ ہیڈ سلیمان کی پاکستان میں داخل ہوئے۔ مولانا اثری کا پورا خاندان اہلحدیث تھا۔ ان کے قصبے اور علاقے میں کوم کلاں (ضلع لدھیانہ) کے مولانا سید مولا بخش کے مواعظ حسنہ کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور یہ لوگ ان سے بہت متاثر تھے۔ ان کے قصبے کے خطیب و امام مولانا عبید اللہ تھے جو کسی زمانے میں غالباً دار الحدیث رحمانیہ دہلی میں پڑھتے رہے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ سرگودھا چلے گئے تھے۔

نومبر 1947ء میں محمد رفیق اثری جلال پور پیروالا آئے تو دار الحدیث محمدیہ جلال پور پیروالا کی ابتدائی شاخ مدرسہ سبل السلام براتی والا میں انھوں نے پرائمری پاس کی۔ اس سے دو سال بعد 1949ء میں دار الحدیث محمدیہ میں داخل ہوئے اور 1956ء میں وہاں سے سند فراغت حاصل کی۔ دار الحدیث محمدیہ میں انھوں نے حضرت مولانا سلطان محمود، مولانا عبد الرحیم عارف، مولانا عبد الحمید، مولانا عبد اللہ مظفر گڑھی، مولانا عبد القادر رمہند، مولانا محمد قاسم شاہ اور حافظ خوشی محمد سے حصولِ علم کیا۔

بعد ازاں دار العلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) کا رخ کیا۔ یہاں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف، مولانا حافظ محمد اسحاق اور مولانا شریف اللہ خاں سے فیضیاب ہوئے۔ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے ارشادات سے بھی استفادے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا دفتر دار العلوم کی بلڈنگ میں تھا اور ان سطور کا راقم اس کے فرائض ادارت سرانجام دیتا تھا، اثری صاحب کی ملاقاتیں مجھ سے بھی رہیں۔

1959ء میں مولانا محمد رفیق اثری دار الحدیث محمدیہ جلال پور پیروالا چلے گئے اور وہاں تدریس کا سلسلہ

[1] یہ تحریر مولانا اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کی کتاب دبستان حدیث سے ماخوذ ہے، آج صاحب التحریر اور ممدوح دونوں شخصیات دارِ فانی سے کوچ کر چکی ہیں۔ غفر الله لهما و أسكنهما في جنانه

شروع کر دیا جو بحمد اللہ اب تک جاری ہے۔ اللہ کے فضل سے بے شمار حضرات ان سے تعلیم حاصل کر چکے ہیں جو مختلف مقامات پر درس و تدریس کی خدمات میں مصروف ہیں۔

مولانا اثری کی تدریسی خدمات کا سلسلہ تقریباً پچاس سال سے جاری ہے اور طلباء ان کے طریق تدریس سے نہایت متاثر ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ وہ بے حد محنت اور انہماک سے یہ بنیادی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

اب آئندہ سطور میں حدیث کے متعلق ان کی تصنیفی خدمات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

❁ ضوء السالك على مؤطا امام مالك: مؤطا امام مالک پر یہ مولانا محمد رفیق اثری کا مختصر حاشیہ ہے۔ اس میں فاضل محشی نے طلباء کی ضرورت کے پیش نظر مرفوع احادیث کی تخریج کی ہے۔ منقطع اور بلاغاتِ مالک کی اسانید کا تعین کیا ہے۔ مشکل الفاظ کو لغوی نقطہ نظر سے حل فرمایا ہے۔ فقہی مسائل کی وضاحت کی ہے اور اختلافی مسائل میں مسلک محدثین کی دلائل کے ساتھ تائید فرمائی ہے۔

یہ کتاب فاروقی کتب خانہ ملتان کی طرف سے متعدد مرتبہ شائع ہو چکی ہے بڑے سائز کے 665 صفحات پر مشتمل ہے۔

❁ التعليق النجيح علىٰ مشكوٰة المصابيح: اس میں مولانا اثری نے احادیث مشکوٰۃ کی تخریج بحوالہ متعلقہ کتاب، باب، جلد اور صفحہ کی ہے۔ فصل ثانی اور فصل ثالث کی احادیث کی استنادی حیثیت کا تعین کیا ہے۔ مشکل الفاظ کا لغوی حل پیش فرمایا ہے۔ فقہی اختلافی مسائل میں بدلائل مسلک محدثین کو ترجیح دی ہے۔ یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی۔ (جس وقت مولانا اسحاق بھٹی صاحب رحمہ اللہ نے یہ تحریر لکھی تھی مطبوع نہ تھی مگر اب مطبوع ہو چکی ہے۔)

مولانا محمد رفیق اثری نے مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے حواشی حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کی تجویز و ترغیب سے تحریر فرمائے ہیں۔ مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب مرحوم اہل علم کی قابلیت کے مطابق انھیں اس قسم کے علمی کاموں کی ترغیب دیتے اور ان سے تحقیقی کام کراتے رہتے تھے۔

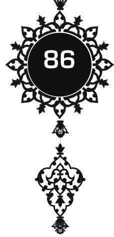
❁ترجمہ وافادات مشکوٰۃ المصابیح: چند سال پیشتر مولانا محمد رفیق اثری نے مشکوٰۃ شریف کے ترجمہ وافادات کا آغاز کیا تھا اور حدیث نمبر 423 تک کام ہوا تھا کہ 4۔نومبر 1995ء کو حضرت مولانا سلطان محمود (جلال پور پیروالا) وفات پا گئے اور دار الحدیث محمدیہ کی تدریسی اور انتظامی ذمے داریوں کا بوجھ مولانا اثری پر آ پڑا، جس کی وجہ سے ترجمہ وافادات کا یہ اہم سلسلہ موقوف ہو گیا۔ان شاء اللہ تعالیٰ مولانا ممدوح یہ ضروری کام مکمل فرمائیں گے۔(یہ بھی مطبوع ہے)



اصولِ حدیث کی معروف کتاب ''الفية الحديث للعراقي'' پر تعلیقات: یہ کتاب طبع ہو چکی ہے بہترین صورت میں مکتبہ امام بخاری کراچی نے شائع کی ہے۔106 صفحات ہیں۔



❁اصولِ حدیث کی ایک اور کتاب ''اسبال المطر شرح نخبة الفكر'' پر تعلیقات یہ بھی شائع ہو چکی ہے۔318 صفحات کی یہ تحقیقی کتاب دار السلام لاہور کی طرف سے چھپی ہے۔



❁منہاج المسلم (اردو ترجمہ): منہاج المسلم شیخ ابو بکر جابر الجزائری رحمہ اللہ کی کتاب ہے۔مولانا محمد رفیق اثری نے اس کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے اور بعض فقہی مسائل پر حواشی میں مدلل انداز میں نقد بھی کیا ہے۔788 صفحات کی یہ کتاب دار السلام لاہور کی طرف سے خوبصورت انداز میں شائع کی گئی ہے۔

❁تبيان الأدلة في رؤية الأهلة: اس کا اردو ترجمہ کیا۔



❁هداية الناسك: اردو ترجمہ

❁شرح خطبة حجة الوداع: مولانا محمد رفیق اثری کی یہ نہایت علمی کوشش ہے جو تقریباً ایک سو صفحات پر مشتمل ہے۔

❁مختلف مسائل پر چند رسائل۔

مولانا محمد رفیق اثری ماشاء اللہ باہمت اہل علم ہیں جنھوں نے تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف اور ترجمے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔یہ دونوں الگ الگ مستقل کام ہیں اور دونوں کو بیک وقت سرانجام دینے کا مطلب یہ

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بڑی قابلیت عطا فرمائی ہے اور خالص علمی ذوق سے نوازا ہے۔

❁ مولانا سلطان محمود جلال پوری: یہ کتاب ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا اثری کی یہ ضخیم کتاب ان کے استاذ محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا سلطان محمود جلال پوری کے حالات پر محیط ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے مولانا ممدوح کی حیات، خدمات اور آثار کا تفصیل سے تذکرہ فرمایا ہے۔ زبان، انداز اور مندرجات کے اعتبار سے یہ کتاب اپنی مثال آپ ہے۔ مولانا سلطان محمود کی زندگی کے تمام پہلو خوبصورت اسلوب میں اس کتاب میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ ان کا خاندان، ان کی تعلیم و تربیت، ان کے اساتذہ، ان کا طریق مطالعہ، ان کا نہج تبلیغ، ان کا اندازِ تدریس، ان کے تلامذہ غرض ان کی حیات مبارکہ کے تمام گوشے اس کتاب کے اوراق میں منضبط کر دئے گئے ہیں اور فاضل مصنف نے حق شاگردی نہایت حسن و خوبی سے ادا کر دیا ہے۔ یہ کتاب مارچ 2006ء میں ''اثری ادارہ نشر و تالیف'' چوک اہلحدیث، جلال پور پیر والا، ضلع ملتان'' کی طرف سے شائع کی گئی ہے اور لاہور، ملتان، گوجرانوالہ اور کراچی کے مکتبوں سے مل سکتی ہے۔ مدارس کے اساتذہ و تلامذہ کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

مولانا محمد رفیق اثری نے اس کتاب میں مشہور منکر حدیث عبد اللہ چکڑالوی، اور اس کے فرزند گرامی مولانا محمد ابراہیم چکڑالوی کا ذکر بھی کیا ہے۔ لکھا ہے کہ مولانا محمد ابراہیم موضع چکڑالا (ضلع جہلم) میں پیدا ہوئے۔ وہ حدیث کے سلسلے میں اپنے باپ کے نظریات کے سخت مخالف تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم علاقہ ہزارہ کے مدارس و مساجد میں حاصل کی۔ پھر دہلی جا کر حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کتب حدیث پڑھیں اور ان سے سند حدیث لی۔ فارغ التحصیل ہو کر خان گڑھ (ضلع مظفر گڑھ) آ گئے تھے۔ آخر میں جلال پور پیر والا میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

ان کے والد عبد اللہ چکڑالوی نے اپنا مخالف ہونے کی بناء پر انھیں عاق قرار دے کر جائیداد سے محروم کر دیا تھا۔ وہ لاہور میں مقیم تھا مولانا محمد ابراہیم ایک دفعہ لاہور گئے تو وہ مکان میں تخت

پر تکیہ لگائے لیٹا ہوا تھا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ میرے حصے کی جائیداد مجھے دیں، مجھے اس سے محروم نہ کریں۔ ساتھ ہی یہ حدیث سنائی کہ:

''مَنْ قَطَعَ مِيرَاثَ وَارِثِهِ، قَطَعَ اللّٰه مِيرَاثَهُ مِنَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ''[1]

''یعنی جو شخص اپنے وارث کو وراثت سے محروم کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اسے جنت کے حصے سے محروم کر دے گا۔''

عبد اللہ چکڑالوی نے جواب دیا، میں حدیث کو نہیں مانتا، اگر قرآن مجید میں یہ بات کہیں ہے تو مجھے دکھاؤ۔ مولانا محمد ابراہیم فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی مجھے خیال گزرتا تھا کہ شاید میرا والد حق پر ہو، لیکن آج جب تخت پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا اور حدیث کا انکار کرتے ہوئے دیکھا تو فوراً نبی کریم ﷺ کی پیشگوئی میرے ذہن میں آ گئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور منکر حدیث ہے۔ پھر یہ دو حدیثیں سنائیں۔

عَنْ عُبَيْدِ اللّٰه بْنِ أَبِي رَافِعٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنِ النَّبِيِّ صلى اللّٰه عليه وسلم قَالَ " لاَ أُلْفِيَنَّ أَحَدَكُمْ مُتَّكِئًا عَلَى أَرِيكَتِهِ يَأْتِيهِ الأَمْرُ مِنْ أَمْرِي مِمَّا أَمَرْتُ بِهِ أَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُولُ لاَ نَدْرِي مَا وَجَدْنَا فِي كِتَابِ اللّٰه اتَّبَعْنَاهُ''[2]

'' ابو رافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں کوئی ایسا نہ ہو کہ میرے حکم کردہ امر و نہی میں سے کوئی بات اسے پہنچے اور وہ اپنے تخت پر تکیہ لگائے ہوئے کہ میں اسے نہیں جانتا۔ ہم تو اس بات کو مانیں گے جو اللہ کی کتاب میں ہے۔''

دوسری حدیث یہ ہے:

عَنِ الْمِقْدَامِ رضي اللّٰه عنه قال قال رَسُولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم " أَلاَ إِنِّي أُوتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ أَلاَ يُوشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلَى أَرِيكَتِهِ يَقُولُ عَلَيْكُمْ بِهَذَا الْقُرْآنِ فَمَا وَجَدْتُمْ فِيهِ مِنْ حَلاَلٍ فَأَحِلُّوهُ وَمَا وَجَدْتُمْ فِيهِ مِنْ حَرَامٍ

[1] سنن ابن ماجه حديث:2703، شیخ البانی رحمہ اللہ و دیگر نے حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے دیکھئے ضعیف ابن ماجه حديث(536) (ادارہ)

[2] سنن الترمذی:2663

فَحَرِّمُوهُ وَاِن مَاحرّم رَسُولِ اللّٰه كما حرّم الله الحديث''[1]

''حضرت مقدام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے قرآن اور اس کی مثل دیا گیا ہے، سنو! قریب ہے کہ ایک آدمی پیٹ بھرا تخت پر بیٹھا ہوگا، کہے گا اس قرآن ہی کو اپناؤ، جو اس میں حلال ہے اسے حلال جانو اور جو اس میں حرام ہے اسے حرام سمجھو، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے جن چیزوں کو حرام (وحلال) قرار دیا ہے اسی طرح ہے گویا اللہ نے حرام وحلال قرار دیا ہے۔''

مولانا محمد ابراہیم یہ منظر دیکھ کر اور احادیث سنا کر، باپ کے مال سے لاتعلق ہو کر واپس چلے آئے۔ مولانا ابراہیم قرآن کے حافظ تھے۔ نیز اپنے دور کے ماہر طبیب تھے اور طبابت ہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ تعلیم وتدریس، امامت وخطابت اور وعظ وتبلیغ کے فرائض فی سبیل اللہ انجام دیتے تھے۔ انھوں نے 20۔ ذیقعدہ 1337ھ (17۔ اگست 1919ء) کو جلال پور پیر والا میں وفات پائی۔

ان کی تبلیغ سے بہت لوگ متاثر ہوئے اور بے شمار لوگوں نے علم دین حاصل کیا اور عامل حدیث ہوئے۔ ان کے شاگردوں نے بھی اشاعت دین کے لیے بہت تگ ودود کی۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

مولانا محمد ابراہیم چکڑالوی کے بیٹے مولانا محمد اسماعیل تھے۔ یہ بھی عالم وفاضل تھے اور دعوت وارشاد میں مشغول رہتے تھے۔ انجمن اہلحدیث جلال پور پیر والا کے خزانچی تھے۔ انھوں نے 23 مارچ 1944ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

مولانا محمد اسماعیل کے تین بیٹے تھے۔ ان کا شمار بھی علمائے دین میں ہوتا تھا۔

مولانا محمد رفیق اثری کی تصانیف میں مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ متعدد رسائل بھی شامل ہیں جو کئی دفعہ چھپ چکے ہیں۔

❁ جہاد اور ہمارے فرائض ❁ اہلحدیث کون؟ ❁ فضائل ومسائل رمضان المبارک
❁ مسائل قربانی ❁ نماز پڑھنے کا مسنون طریقہ ❁ جنازہ پڑھنے کا طریقہ

---

[1] سنن ابی داؤد: 515

❁ فقہاہت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ❁ مقام معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مولانا اثری نے السیف المسلول کا اردو ترجمہ بھی کیا۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ میں نے اپنی کتاب ''کاروانِ سلف'' میں حضرت مولانا سلطان محمود مرحوم ومغفور پر طویل مضمون لکھا ہے۔ اس میں ان کے چند معروف تلامذہ کا مختصر الفاظ میں تعارف کرایا ہے، جن میں سب سے پہلے مولانا محمد رفیق اثری کا اسم گرامی آتا ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ ''مولانا اثری کچھ عرصہ اوکاڑہ کی جامعہ محمدیہ میں بھی فریضہ تدریس انجام دیتے رہے ہیں۔''



لیکن مولانا اثری نے بذریعہ خط مجھے اطلاع دی کہ وہ کبھی بھی جامعہ محمدیہ سے بطور مدرس منسلک نہیں رہے۔ میں اپنی اس غلطی پر معذرت خواہ ہوں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان کے انکار کے باوجود میرے ذہن میں اب بھی یہی آرہا ہے کہ وہ جامعہ محمدیہ میں پڑھاتے رہے ہیں اور میری ان سے وہاں ملاقات ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں دو متضاد اقوال کے درمیان تطبیق دینے کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔ میں بھی یہاں تطبیق کی کوئی صورت پیدا کرلوں تو کیا حرج ہے۔





ان کا انکار اور میرے ذہن کے مطابق ان کی وہاں تدریس کے درمیان میرے خیال میں ''تطبیق'' کی یہ صورت ہے کہ کسی وقت میری اور ان کی جامعہ محمدیہ میں اتفاقاً ملاقات ہوئی ہوگی، جس سے میں نے یہ سمجھا کہ وہ یہاں فریضہ تدریس انجام دینے پر مامور ہیں۔ میرے خیال میں اس تطبیق سے مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔ بہرحال میں اپنی اس غلطی (یا غلط فہمی) کا اعتراف کرتا ہوں۔ کاروانِ سلف دو یا تین مرتبہ چھپ چکی ہے۔ اب ناشر سے رابطہ کرکے یہ الفاظ ان شاء اللہ کتاب سے نکلوا دوں گا۔







مولانا محمد رفیق اثری تقریباً ڈیڑھ برس قبل از راہِ کرم غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔ ان کے ساتھ دارالحدیث پیروالا کے قابل احترام اور عالی قدر استاذ مولانا اللہ یار خاں کے نوجوان صاحبزادے مولانا عمران بھی تھے جو دارالحدیث میں خدمت تدریس پر مامور ہیں۔ مولانا اثری ستر سال کو پہنچ گئے ہیں۔ عمر کے لحاظ سے صحت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ پورا قد، مناسب جسم، گندم گوں، سفید داڑھی، بارعب شخصیت کے مالک۔ نقش ونگار جاذب نظر، خوش مزاج، خوش کلام، اور حلیم الطبع۔ ایة من آیات اللہ۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ انھیں عمر دراز عطا فرمائے اور وہ اللہ کے دین کی خدمت میں مشغول رہیں۔ تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھیں۔ آمین یا ربّ العالمین!

انٹرویو

شیخ الحدیث مولانا رفیق اثری صاحب رحمہ اللہ

انٹرویو: عمر فاروق بن مظفر اقبال [1]

نام ونسب، پیدائش اور خاندانی پس منظر

سوال: شیخ محترم اپنے نام ونسب اور پیدائش کے بارے بتلائیں؟

جواب: قاضی سیلمان منصور پوری رحمہ اللہ کے استاد مولانا عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ کو ریاست پٹیالہ کی طرف سے رقبہ ملا تھا۔ انہوں نے وہاں اپنے مویشیوں کے لیے باڑہ بنایا، اپنی رہائش بھی وہیں بنالی اور آپ کے بیٹے بھی وہاں آباد ہو گئے جو آہستہ آہستہ مکمل گاؤں میں تبدیل ہو گیا مولانا عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ نے اس کا نام عزیز آباد رکھا۔ مگر وہ لوگوں میں رشیداں والا کے نام سے مشہور ہوا۔ اور سرکاری کاغذات میں بھی رشیداں والا کے نام سے ہی مندرج ہے۔ میری پیدائش اسی گاؤں میں ہوئی تھی۔ ان دنوں لوگوں میں بکرمی سن زیادہ چلتی تھی۔ والدہ محترمہ نے بھی بکرمی تقویم کو یاد رکھا جو عیسوی حساب سے 1937 بنتا ہے۔ میری پیدائش سے ستراسی برس پہلے یہ گاؤں آباد ہوا تھا اور میری پیدائش کے وقت یہ دو سو گھرانوں پر مشتمل تھا۔

والدین نے میرا نام محمد رفیق رکھا تھا۔ جب تعلیم وتعلم میں قدم رکھا تو اثری کا اضافہ میں نے خود کیا۔ ہمارے آباء میں سب سے پہلے جس نے اسلام قبول کیا ان کا نام طیب تھا۔ ہمارا اسلام میں نسب نامہ کچھ یوں ہے:

محمد رفیق بن قائم دین بن علی شیر بن فرید و بن طیب، میرے دادا فرید و اپنا پرانا مسکن چھوڑ کر رشیداں والا آئے تھے۔

سوال: آپ کے کتنے بھائی ہیں؟

جواب: ہم تین بھائی تھے۔ ایک کا نام رحمت اللہ دوسرے کا نام سلیم اور تیسرا میں ہوں۔ وہ دونوں

[1] فاضل مرکز العلوم الاسلامیہ ستیانہ بنگلہ

فوت ہو چکے ہیں صرف میں ہی زندہ ہوں۔

سوال: آپ کے والد گرامی اور بھائیوں کی کیا مصروفیات رہی ہیں؟

جواب: میرے والد محترم نے ادھر شہر میں پرچون کی دکانداری کی تھی۔

مجھ سے بڑا بھائی محمد سلیم یہاں پڑھتا تھا۔ کل آٹھ کلاسیں ہیں، اس نے سات پڑھی تھیں، ایک سال رہ گیا تھا کہ خاندانی ضروریات کی وجہ سے اسکی شادی ہوگئی اور وہ کاروبار میں چلا گیا۔ والد محترم کی دکان بھائی نے سنبھال لی اور یہ پرچون کی دکان بعد میں کپڑے کی دکان میں تبدیل ہوگئی۔ بڑا بھائی رحمت اللہ جب ہندوستان سے آئے تھے اس وقت اس کی عمر پچیس برس کے قریب تھی۔ اس نے یہاں آ کر کپڑے کا کاروبار شروع کیا۔ بعد میں اس نے لکڑی کی تجارت شروع کر دی۔ لاہور اور کراچی تک وہ لکڑی سپلائی کیا کرتا تھا۔





سوال: پہلے لوگ تہجد کے بہت پابند ہوتے تھے آپ کے گھرانے کی کیا صورتحال تھی؟



جواب: جی بالکل پہلے لوگوں میں تہجد پر بڑی سختی سے پابندی ہوتی تھی اور اللہ کے فضل سے میرے والد محترم اور میرے دونوں بھائی تہجد گزار تھے۔ والحمد للہ

سفر ہجرت اور جلال پور میں سکونت

سوال: شیخ محترم آپ رشیداں والا سے یہاں تک کب اور کیسے پہنچے؟



جواب: 1947ء کے فسادات کے دوران مجھے یاد ہے کہ میری عمر تقریباً گیارہ برس تھی۔ ہمارا گاؤں مشرقی پنجاب کا حصہ تھا۔ ہمارا گاؤں تقریباً مسلمانوں پر مشتمل تھا فقط ایک محلہ ہندوؤں کا تھا عید الاضحیٰ سے چند دن پہلے رات کے وقت شور سا اٹھا کہ حملہ ہوگیا ہے وہاں سے سب لوگ نکل کر چھ میل کے فاصلے پر پیپل نامی گاؤں پہنچ گئے وہاں ساری آبادی مسلمان تھی۔ پندرہ بیس دن بعد عید الاضحیٰ کا موقع آ گیا عید ہم نے وہیں پڑھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں بھی عید گاہ گیا تھا عید گاہ کے میناروں پر اس ڈر سے کہ کہیں حملہ نہ ہو جائے چاروں طرف مسلح افراد کو پہرے پر بٹھایا گیا تھا عید کے دوسرے روز ہندو ملٹری آئی تھی۔ انہوں نے کہا تم سب لوگ شہر خالی کر دو اور پاکستان چلے جاؤ۔ ہندو ملٹری قافلہ لیکر چلی۔ قافلہ پیدل ہی تھا۔ گنڈا سنگھ کے قریب

ہیڈ سلیمان کی سے ہم لوگ پاکستان داخل ہوئے۔ میری یادداشت کے مطابق تمام لوگوں کے نام بھی درج کیے گئے۔ حکومتی کارندے کسی کو ملتان، کسی کو لودھراں، کسی کو ڈیرہ غازی خان اور کسی کو کسی طرف بھیج رہے تھے۔ ہمیں ڈیرہ غازی خان کی طرف جانے کو کہا گیا۔ ہم ریلوے کے اندر جگہ نہ ہونے کے باعث چھت پر سفر کر کے لودھراں تک آئے۔ چند روز ادھر رکے۔ بزرگ بتاتے ہیں کہ وہاں ڈیرہ غازی خان کے بارے دریافت کیا تو لوگوں نے بتایا کہ وہ تو پہاڑی اور بنجر علاقہ ہے، جب کہ ہمارے اکثر لوگ کاشتکار اور میدانی علاقوں میں رہنے والے تھے۔ انہوں نے کہا بھائی ہم وہاں نہیں جاتے ہم ادھر ہی کہیں جگہ تلاش کرتے ہیں۔ پھر ملتان چلے گئے۔ ایک مہینہ وہاں رہے۔ تب تک سردی گزر چکی تھی۔ وہاں ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے علاقے کے کچھ لوگ جلال پور پہنچ چکے ہیں۔ اباجان اور ان کے دوسرے بھائی جلال پور یہ دیکھنے آئے کہ واقعی رشیداں والا کے لوگ یہاں آئے ہیں؟ وہاں جا کر دیکھا کہ ہمارے گاؤں کے کئی گھرانے ادھر پہنچ چکے ہیں۔ انہوں نے کہا چلو ایک بار اکٹھے ہوتے ہیں بعد میں دیکھیں گے کہ کہاں رہنا ہے۔ پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ مقامی لوگوں نے ساری جمع پونجی لوٹ لی تھی سارا شہر خالی پڑا تھا۔ اس وقت سے ہمارا قبیلہ یہاں آباد ہے۔ راجپوت بھٹی خاندان ہے۔ پچاس ساٹھ کے قریب ہمارے گھرانے تھے سارے ادھر آباد ہو گئے بعد میں کچھ کراچی چلے گئے۔ کچھ رحیم یار خان چلے گئے۔

حصول علم اور اساتذہ کرام

سوال: اپنی علمی منازل کے بارے آگاہ فرمائیں؟

جواب: ناظرہ قرآن مجید میں نے ہندوستان میں پڑھا، قرآن مجید کی ابتداء مولانا حافظ غلام نبی صاحب رحمہ اللہ سے کی تھی۔ جب ہم یہاں آئے تھے میں انتیسواں اور تیسواں پارہ پڑھ چکا تھا۔ یہاں ہمارے گھر کے ساتھ ہی ایک دیوبند کی مسجد تھی۔ اس مسجد میں تقریباً ایک ماہ مولانا حافظ نور محمد صاحب رحمہ اللہ سے پڑھتا رہا۔ جب کہ رشیداں والا گاؤں میں مولانا عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ اور دار الحدیث رحمانیہ کے ایک فارغ التحصیل عالم کے مواعظ حسنہ کی وجہ سے

میرے والد گرامی، میرے تمام چچا، خاندان کے دیگر افراد، تمام کاشت کار بلکہ مکمل گاؤں ہی اہل حدیث تھا۔ اس لیے ہم نے پوچھا یہاں کوئی اہل حدیث کی مسجد ہے؟ تو ہمیں اس مسجد میں پہنچا دیا گیا یہاں حافظ خوشی محمد صاحب رحمہ اللہ تھے۔ انکے پاس قرآن مجید پڑھتا رہا اور انہیں کے پاس مکمل کیا۔

پرائمری اور ابتدائی فارسی

لودھراں کے قریب براتی والا کے نام سے ایک جگہ ہے۔ وہاں جلالپور مدرسہ کے فارغ التحصیل مولانا عبد الرحمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ انہوں نے پرائیویٹ سکول بنایا تھا۔ انکی ترغیب سے محلے اور خاندان کے تقریباً پندرہ لڑکے ان کے پاس چلے گئے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ انہوں نے ہمیں پرائمری تک پڑھایا، فارسی بھی پڑھائی اور ہمیں خوشخطی بھی سکھائی۔ ان دنوں کشمیر کا محاذ کھل چکا تھا وہ ساتھ ساتھ ہمیں فوجی تربیت بھی دیتے تھے۔ وہاں سے پرائمری کے بعد میں واپس آ گیا۔

علوم اسلامیہ

مولانا عبید اللہ صاحب رحمہ اللہ، مولانا ادریس صاحب رحمہ اللہ اور دیگر علماء جو دار الحدیث رحمانیہ کے فضلاء تھے اور ہمارے گاؤں کے مسلک اہل حدیث قبول کرنے میں بڑا عمل دخل رکھتے تھے، والد صاحب ان سے کافی متاثر تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان کی طرح ہمارے بچے بھی پڑھنے چاہئیں۔ مجھے اور بڑے بھائی دونوں کو مدرسہ میں داخل کرا دیا۔ 1956ء میں فارغ ہوا۔ اسی سال مولوی فاضل کا امتحان دیا۔

سن 54، 55 اور 56 کی چھٹیوں میں لاہور تقویۃ الاسلام بھی جاتا رہا۔ وہاں مولانا شریف صاحب سے منطق اور فلسفہ پڑھتا رہا۔ ہمارے کافی کلاس فیلو تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی تدریسی میدان میں نہیں آیا اس لیے سب کے نام بھول چکا ہوں۔ میرے کلاس فیلوز میں سے صرف مولانا عبد اللہ امجد چھتوی رحمۃ اللہ علیہ ہی اس میدان میں اترے۔ بعد میں بھی ہماری دوستی قائم رہی۔ وقتاً فوقتاً ہماری ملاقات بھی ہوتی رہتی تھی۔ البتہ مولانا شریف صاحب کے پاس

جو طالب علم آتے تھے ان میں سے ایک مولانا محمد علی جانباز رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔

سوال: مولانا شریف صاحب سے مولانا شریف اللہ خان سواتی رحمہ اللہ مراد ہیں یا کوئی اور رہیں؟

جواب: جی۔ یہ مولانا شریف اللہ خان سواتی ہی ہیں، یہ جامعہ سلفیہ میں پڑھاتے تھے۔ اور چھٹی کے دنوں میں مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر تقویۃ الاسلام میں شمس بازغۃ، سلم العلوم، ھدایۃ الحکمۃ اور منطق وفلسفہ کی دیگر کتب پڑھاتے تھے۔ میں نے یہ کتب مولانا سلطان محمود محدث جلالپوری رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی تھیں پھر مولانا شریف اللہ خان صاحب سے دوبارہ پڑھیں۔

اساتذہ کرام

سوال: شیخ محترم ہم آپ کے اساتذہ کے بارے جاننا چاہتے ہیں؟

جواب: چند ایک اساتذہ "حافظ غلام نبی صاحب، حافظ نور محمد صاحب، حافظ خوشی محمد صاحب، مولانا عبد الرحمان صاحب، مولانا شریف اللہ سواتی صاحب اور مولانا سلطان محمود محدث جلالپوری صاحب رحمۃ اللہ علیہم" کا تذکرہ تو ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ میرے اساتذہ میں مولانا عبد الحمید صاحب، مولانا عبد القادر بہاولپوری صاحب، مولانا عبد الرحیم عارف صاحب، مولانا محمد قاسم شاہ صاحب، مولانا عبد القادر رمہند صاحب، مولانا عبد اللہ مظفر گڑھی صاحب اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمۃ اللہ علیہم شامل ہیں۔ میں نے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ میں ان کے پاس ہر سال جاتا تھا۔ وہ میری بہت راہنمائی کرتے تھے۔

عملی میدان

سوال: شیخ محترم فراغت کے بعد کون کون سے مشاغل رہے ہیں؟

جواب: فراغت کے بعد شیخ محترم مولانا سلطان محمود محدث جلالپوری رحمہ اللہ نے مجھے یہیں پر تدریس کا حکم دیا۔ میں اس وقت سے لیکر آج تک اسی جگہ پر پڑھا رہا ہوں۔ لاہور میں مولانا عطاء اللہ صاحب رحمہ اللہ کے حکم پر میں نے چند مضامین بھی لکھے تھے۔ جو مولانا اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کی نظروں سے گزرے۔ کافی عرصہ بعد مولانا اسحاق بھٹی کے پاس میرا تذکرہ ہوا تو کہنے لگے

یہ وہی رفیق ہے جس کا خط بہت اچھا ہے۔ ساتھیوں نے کہا جی وہی ہے۔

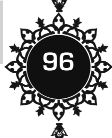
میں نے اس سے اندازہ لگایا تھا کہ مولانا اچھا حافظہ رکھتے ہیں۔ لیکن ایک بات میں ان کو بھی مغالطہ لگ گیا۔ میرے بارے انہوں نے لکھ دیا کہ میں نے ایک سال جامعہ محمدیہ اوکاڑہ میں گزارا ہے۔ مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ میں سن 56ء سے لیکر آج تک اسی مدرسے پڑھا رہا ہوں اور کہیں نہیں گیا۔



نوٹ: ”اس موقع پر میں نے وہ تطبیق ذکر کی جو اسحاق بھٹی صاحب رحمہ اللہ نے دبستان حدیث میں شیخ کے ترجمہ میں دی ہے۔ اور شیخ محترم نے فرمایا کہ ممکن ہے ایسے ہی ہو۔“ اس کے ساتھ ساتھ میں نے تصنیف و تالیف پر بھی توجہ دی پچیس چھبیس کتب لکھ چکا ہوں۔



تصنیف و تالیف



سوال: آپ کو تصنیفی ذوق کیسے پیدا ہوا؟



جواب: تقسیم ہند کے بعد لوگوں کے بڑے بڑے رقبے رکے ہوئے تھے۔ مسائل کے حل کے لیے پورے علاقے میں دیوبندی، بریلوی یا شیعہ حضرات کا کوئی ایسا ادارہ نہیں تھا جو صحیح طور پر جواب دے سکتا ہو حکومتی اہل کار بھی لوگوں کو ہمارے ہاں ہی بھیجتے تھے۔ میرا خط اچھا تھا اس لیے شیخ محترم مجھ سے فتاویٰ جات لکھوایا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد وہ مجھے فرماتے کہ جواب لکھ دو میں تصدیق کر دوں گا۔ اس طریقہ سے انہوں نے مجھے اس لائن پر ڈالا۔ اور اس ذوق میں زیادہ ہاتھ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کا تھا۔ آپ وقتاً فوقتاً مضامین لکھواتے رہتے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ کتب احادیث کے جتنے حواشی ہیں سب حنفیت زدہ ہیں ان کو کم از کم اہل حدیث بنانا چاہیے۔



اس جذبے سے میں نے موطا اور مشکوۃ کے حواشی لکھ کر اپنا حصہ ڈالا ہے۔ اسی طرح الفیۃ الحدیث کے حواشی ہیں۔

کئی تراجم بھی کیے ہیں۔ ایک عرب عالم الشیخ عبد اللہ بن عبید کی کتاب ھدایۃ الناسک کا مناسک الحج کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ رؤیت ھلال کے بارے ایک کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔

اسی طرح شرح خطبہ حجۃ الوداع۔ اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ کی شیعہ کے بارے ایک السیف المسلول نامی کتاب ہے۔ یہ صرف ایک بار ہی دہلی سے چھپی تھی۔ لیکن ہمیں مطبوع نہیں مل سکی ہمیں مخطوط ملا تھا۔ اس میں ناموں کی کافی ساری غلطیاں تھیں۔ مجھ سے جس حد تک ممکن ہوا میں نے اسکی اصلاح اور ترجمہ کر کے چھپوا دیا۔ میرے علاوہ کسی نے اس کا ترجمہ نہیں کیا۔

سوال: شیخ محترم آپ نے التعلیق النجیح میں علامہ البانی رحمہ اللہ بہت اعتماد کیا ہے۔ جب کہ ضوء السالک میں اس طرح نہیں ہے، بلکہ ضوء السالک میں تو تحقیق پر کوئی بحث نہیں کی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: جی بالکل۔ آپ نے جو نوٹ کیا ہے وہ درست ہے۔

مشکوٰۃ کی پہلی فصل میں تو تحقیق کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ دوسری اور تیسری فصل کی روایات کی اسانید کے رواۃ پر بحث کر کے خود حکم نہیں لگایا بلکہ محدثین پر اعتماد کیا ہے۔ جس روایت میں بھی کسی محدث کا حوالہ ملا وہ دیدیا۔ جہاں نہیں ملا وہاں علامہ البانی رحمہ اللہ کا حوالہ دیدیا ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے چونکہ یہ کام انتہائی محنت سے کیا ہے۔ اس لیے ان کو مقبولیت حاصل ہے۔ اور انکی تحقیقات آسانی سے مل بھی جاتی ہیں۔ اس لیے میں نے اکثر انہی کے حوالے دیئے ہیں۔ اور ضوء السالک میں یہ کام اس لیے نہیں کیا کہ مرفوع روایات کی اسانید پر امام مالک رحمہ اللہ پر اعتماد کیا ہے۔ وہ بہت بڑے امام ہیں۔ جن کی سندیں انہوں نے پیش کی ہیں وہ مشہور و معروف سندیں ہیں۔ جن کی سندیں معلق کر رہے ہیں ا۔ کے بارے بھی جمہور محدثین کی یہ رائے ہے کہ وہ صحیح ہیں۔ سوائے چار روایات کے۔ لیکن ابن صلاح رحمہ اللہ نے ان کی بھی بحث و تحقیق کر دی ہے۔ البتہ آثار صحابہ و تابعین کی تحقیق و تخریج اس وقت نہیں کر سکا۔ اب میں نے اردو ترجمہ چھپوایا ہے۔ اس میں آثار کی تحقیق و تخریج بھی کر دی گئی ہے۔

آج کل معجم ابی یعلیٰ پر کام جاری ہے۔ جس پر فیض الرحمٰن ثوری صاحب نے تحقیق و تخریج کی ہے۔

علامہ ناصر الدین البانی اور حافظ زبیر علی زئی رحمۃ اللہ علیہما

سوال: شیخ محترم علامہ البانی رحمہ اللہ کے ساتھ ساتھ حافظ زبیر علی زئی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تحقیق و تخریج کا کام کیا ہے اور علامہ البانی رحمہ اللہ سے کئی مقامات پر اختلاف بھی کیا ہے؟ آپ راجح کسے سمجھتے ہیں؟

جواب: مجموعی طور پر ان کا کام بہت زبردست ہے۔ والحمد للہ۔ محنت بھی کافی کی ہے۔ رجال پر انکی نظر بھی وسیع ہے۔ بحث بھی خوب کرتے ہیں۔ ان سے تھوڑا سا ہمارا اختلاف ہے۔ زیادہ نہیں ہے۔ تھوڑا سا ہی ہے۔ وہ یہ کہ ایک روایت کو ایسا راوی بیان کرے جس راوی پر ہلکی سی جرح ہو۔ اگر اس کی تائید دوسری روایت سے ہو رہی ہے وہ بھی کچھ کمزور ہے۔ تیسری سے ہو رہی ہے وہ بھی کچھ کمزور ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ساری جلی ہوئی رسیاں ہیں۔ ضعیف + ضعیف + ضعیف + ضعیف = ضعیف۔ ہم اس کو درست نہیں سمجھتے۔ ہم سمجھتے ہیں درست بات جو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی ہے کہ مختلف روایات مل جائیں تو سندیں اگرچہ ہلکی ہلکی کمزور ہوں موضوع یا منکر حد تک نہ پہنچیں۔ وہ مجموعی حیثیت سے حسن لغیرہ کے درجے میں آجائے گی۔ اور اس پر اعتماد ہو سکتا ہے۔ یہ نظریہ شیخ صاحب کا تھا۔ اور ہم کسی شمار و قطار میں تو نہیں آتے البتہ تائید اسی کی کرتے ہیں۔

مناظرہ

سوال: شیخ محترم آپ کا کبھی مناظرہ ہوا ہو یا اس طرح کا کبھی شوق رکھا ہوا؟

جواب: میں نے دو مناظرے کیے تھے۔ 1975ء کی بات ہے۔ ادھر ہمارے ہاں کھاکھی قوم کی بستی ہے۔ وہاں سورت فاتحہ پہ مناظرہ ہوا تھا۔ دیو بندیوں کی طرف سے مولانا خدا بخش حنفی تھے۔ میں نے سورت فاتحہ پڑھنے کے پندرہ دلائل دیئے۔ جب کہ وہ مطلق ممانعت قراءت کی روایات پیش کرتے رہے۔ میں نے کہا بھائی ہم دیگر قراءت نہیں کریں گے آپ فاتحہ نہ پڑھنے کا حکم دکھائیں۔؟ شرط میں بھی یہی طے ہے کہ اہل الحدیث فاتحہ پڑھنے کی دلیل دیں گے اور دیو بندیوں نے دکھانا ہے کہ نہ پڑھنے کا حکم ہو؟ لیکن وہ یہ نہیں دکھا سکے۔ بہر حال جو پانچ چھ گھر مناظرہ کرا رہے تھے وہ سب اہل حدیث ہو گئے۔ وہ

اب تک اہل حدیث ہیں۔ والحمد للہ۔

دوسرا مناظرہ

دوسرا مناظرہ میراں پور میں ہوا یہ بھی حنفی دیوبندی عالم خدا بخش ہی کے ساتھ تھا۔ اور موضوع بھی فاتحہ ہی تھا۔ پہلے مولانا خدا بخش نہیں آئے تھے، ان کے ایک اور عالم تھے۔ ان کا نام تھا سلطان محمود۔ ان سے بحث ہوئی۔ یہ جواب نہ دے سکے۔ ان کی عمر مجھ سے کافی زیادہ تھی۔ وہ کہنے لگے یہ بزرگ ہیں ہمارے دوسرے عالم آرہے ہیں وہ جواب دیں گے۔ میں نے کہا اگر یہ کہہ دیں کہ میں جواب نہیں دے سکا تو میں ان سے بات کروں گا۔ اتنے میں مولانا خدا بخش آگئے۔ ہمارے ساتھی کہنے لگے کہ درگزر کریں اور ان سے بحث کریں، بات شروع ہوئی۔ پانچ پانچ منٹ مقرر ہوئے۔ ہر فریق کے لیے کل وقت اڑھائی گھنٹے مقرر ہوا۔ میں نے ترمذی شریف کی روایت پیش کی کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فرمایا تھا سورت فاتحہ کے علاوہ کچھ نہ پڑھا کرو۔ انہوں نے پڑھی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ فاتحہ کے علاوہ کچھ نہ پڑھا کرو۔ مولانا خدا بخش کے منہ سے یہ نکل گیا۔

(ہک منحوس ہی اوہ آکھیا اسی پڑھنے ہونے آں)

ایک منحوس شخص تھا جس نے کہا تھا کہ ہم پڑھتے ہیں۔ (معاذ اللہ)

میں نے اسی بات پر پکڑ کرلی۔ میں نے کہا بحث ختم ہوگئی ہے اس نے صحابی کو منحوس کیوں کہا ہے؟ وہ تھا تو صحابی! اس نے فاتحہ پڑھی یا نہ پڑھی۔ یہ الگ بات ہے۔ آپ یہ بتائیں اس نے صحابی کو منحوس کیوں کہا؟ پہلے اس کا جواب دو پھر آگے چلیں گے۔ وہ کہنے لگے نہیں جی، آپ مسئلے کا جواب دیں۔ میں نے مسئلے کا جواب بعد میں دوں گا پہلے یہ معافی مانگے اس نے صحابی کے بارے میں غلط زبان استعمال کی ہے۔ دیوبندیوں کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے اپنا ایک کردار ہے۔

سب کہنے لگے یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں آخر اس نے صحابی کو منحوس کیوں کہا؟

اس نے کہا جی مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ میں نے کہا اس میں غلطی ہے تو باقی مسائل میں بھی غلطیاں

ہیں۔ بات وہیں ختم ہوگئی۔

اس خفت کو مٹانے کے لیے وہاں ایک بڑا مناظرہ ہوا۔ انہوں نے کہا یہ تو علاقائی علماء تھے۔ ہم نے بڑے عالم کو بلاتے ہیں آپ بھی اپنے کسی بڑے عالم کو بلائیں۔ انہوں نے گوجرانوالہ سے قاضی عصمت اللہ صاحب اور قاضی ثمر دین صاحب کو بلایا۔ ہم نے مولانا عبد القادر روپڑی صاحب کو بلایا۔ مقابلہ زبردست تھا۔ ملتان سے اہل حدیثوں کی ایک بس بھر کر آئی تھی۔ اتنے لوگ ہم بھی یہ دریا پار کر کے لے گئے تھے۔ کتابیں اپنے مدرسے سے ہی لے گئے تھے۔ ہم نے اُدھر کتابوں کا بہت بڑا ڈھیر لگا دیا تھا۔ احناف کے مناظر قاضی عصمت اللہ صاحب مقرر ہوئے تھے۔ ان کے معاون مولانا عبد الرحمن تھے۔ البتہ مولانا رفیق مدن پوری بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ بھی اچھے مباحث تھے۔ ہمارے مناظر مولانا عبد القادر روپڑی مقرر ہوئے اور ان کا معاون میں تھا۔ پہلی تقریر مولانا روپڑی صاحب کی تھی۔ انہوں نے بیان کیا قاضی صاحب نے جواب دیا۔ چونکہ پہلے ایک مناظرہ ہو چکا تھا۔ مقابلہ بازی میں پورے علاقے کے لوگ جمع تھے۔ زبردست مجمع تھا۔ قاضی صاحب کی آواز باریک اور مدھم سی تھی جو زیادہ مؤثر نہیں تھی۔ جب کہ روپڑی صاحب کی آواز بلند تھی اور آپ دھڑلے سے بولتے تھے۔ روپڑی صاحب سارے مجمعے پر چھا گئے۔ مولانا روپڑی صاحب نے حقیقۃً حق ادا کر دیا تھا۔ میرا کردار یہ تھا کہ آپ جو روایت پیش کرتے میں فوراً کتاب سامنے کر دیتا۔ ان کا مناظر جو روایت پیش کرتا میں کتاب نکال کر حافظ صاحب کو دکھاتا اور نشان لگا دیتا کہ اس میں فلاں کمزوری ہے۔ ان کے مناظر نے بیھقی کی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی روایت پیش کی جس میں ہے کہ تم سورت فاتحہ پڑھا کرو الا وراء الإمام۔ حالانکہ امام بیھقی نے خود ہی اس روایت کی تردید کی ہے۔ کتاب تو ہمارے پاس بھی تھی لیکن میں نے مولانا صاحب سے کہا کہ ان سے کتاب لیکر انہی کی کتاب سے دکھائیں کہ روایت صحیح نہیں ہے۔ روپڑی صاحب کھڑے ہو کر فرمانے لگے کہ غلط بیانی کرتے ہو کتاب دکھاؤ۔ انہوں نے کہا کتاب دکھانا شرائط میں سے نہیں ہے۔ مناظرے کی صدارت







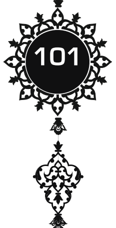

چیئرمین کر رہا تھا۔ ہمارے اصرار پر اس نے کہا کہ بھائی کتاب دکھائیں اس میں کیا حرج ہے؟ انہوں نے کہا ہماری کتاب گم ہوگئی تو؟ چیئرمین نے کہا میں ضامن ہوں۔ روپڑی صاحب نے انہی کی کتاب سے دکھادیا کہ یہ روایت ضعیف ہے۔ چیئرمین نے کہا بس کرو مناظرہ ہوگیا ہے۔ ہم نے سمجھ لیا ہے۔ ہم آئندہ سورت فاتحہ پڑھا کریں گے۔ فقط فاتحہ تو نہیں پڑھنی تھی وہ رفع الیدین بھی کرنے لگے۔ ساری بستی اہل حدیث ہوگئی۔ اب تک اہل حدیث ہیں۔ ان کے بچے ہمارے ہاں پڑھتے رہے۔ کئی فارغ التحصیل ہو کر گئے۔ اب انہوں نے اپنا مدرسہ بنا رکھا ہے۔





شیعہ امام بارگاہ کا پڑوس

سوال: شیخ محترم آپ کے ساتھ ہی امام بارگاہ ہے ان کے ساتھ کیسا معاملہ رہتا ہے؟



جواب: پہلے یہاں مقابلے بہت زیادہ ہوتے تھے۔ شیخ صاحب رحمہ اللہ، ہمارے ساتھی اور میری ہمیشہ سے کوشش رہی کہ ان کے ذاکر بعض اوقات ادھر آ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے جو باتیں کر جاتے ہیں ان کا فوری طور پر جواب ہو جائے۔ اب یہ دس دن جو پیٹتے ہیں، خرافات کرتے ہیں ہم گیارہ محرم کو ادھر جلسہ کرتے ہیں اور تمام باتوں کا جواب دیتے ہیں۔ اس بار بھی ہمارا جلسہ ہوا ہے اور بڑا کامیاب رہا۔ مسجد اور صحن بھر گیا تھا۔ باہر بھی لوگ کافی تعداد میں موجود تھے۔ سبطین شاہ نقوی صاحب، طیب الرحمان صاحب آف اسلام آباد، خلیل الرحمٰن جاوید صاحب آف کراچی، ضیاء الحق بھٹی صاحب اور عبد اللہ داؤد صاحب تھے۔ (حفظہم اللہ) علماء نے بہترین خطابات کیے۔ میں نے بیس پچیس منٹ واقعہ کربلا کی حقیقت پر گفتگو کی۔



اب یہ سنبھل گئے ہیں ادھر کوئی بکواس نہیں کرتے ان کو علم ہے کہ اگر اس طرح کی کوئی بات کی تو فوری طور پر ہمیں اس کا جواب مل جانا ہے کیونکہ ادھار تو ہم کرتے نہیں۔

ایک موقع پر انہوں نے ایک ذاکر کو ادھر بلایا۔ مغرب کے بعد اس نے خطاب کیا اور تنقیدات شروع کر دیں۔ دس پندرہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور ہم صبح فجر کے بعد اس کا جواب دے دیتے تھے۔ ایک دن اس سے غلطی ہوگئی قرآن مجید کی آیت

....غَيْرَ نَاظِرِينَ إِنَاهُ...میں إِنَاهُ کا ترجمہ برتن کر دیا۔اور کہا کہ (معاذ اللہ) صحابہ لالچی تھے اللہ کے رسول کے برتنوں میں دیکھا کرتے تھے کہ کیا پڑا ہے۔اللہ نے منع کر دیا کہ برتنوں کو نہ دیکھا کرو۔میں نے پکڑ کر لی کہ إِنَاهُ کا برتن معنی کس نے کیا ہے؟

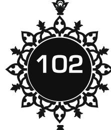
میں نے قربان علی شاہ کے ترجمے کا حوالہ دیا کہ اس نے اس کا معنی پکنا کیا ہے۔اور خوب خبر لی کہ إِنَاهُ کا معنی تک نہیں آتا اور علمی تقریروں کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے۔ایسے شخص کو شرم آنی چاہیے۔



اگلے دن شام کو اعلان کر دیا کہ نہ تو کوئی شیعہ اہل حدیث ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی اہل حدیث شیعہ ہوتا ہے۔یہ سلسلہ ختم کرنا چاہیے۔آئندہ ہم بھی چپ اور آپ بھی چپ رہیں گے۔



ایک بار ایک ذاکر کو لاکھوں روپے دیکر بلایا اس نے کچھ بکواس کی۔ہم نے اس کا سختی سے جواب دیا تو چند روز بعد ایک غنڈہ یہاں آیا دروازے پر دستک دی۔میرا پوچھا۔ میں آیا تو کہنے لگا کہ غضنفر حسین (ایک غنڈہ) کو جانتے ہو؟ میں نے جرات مندانہ لہجے میں جواب دیا ہاں جانتا ہوں۔آؤ جو کرنا ہے کرلو۔ہم بھی تم کو دیکھ لیتے ہیں۔!





میرا جواب سن کر مرعوب ہو کر چل دیا۔دوبارہ نہیں آیا۔الحمد للہ یہ مرعوب ہیں۔سارا علاقہ اہل حدیثوں کا ہے۔شیعہ کے صرف چند گھر ہیں۔ہر ایک کو اپنی جگہ بولنے کا حق ہے اس بناء پر بولتے ہیں ورنہ ان میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ سختی سے بات کرسکیں۔



نکاح واولاد

سوال: شیخ محترم اپنی اولاد وزواج کے بارے بتلائیں؟

جواب: اللہ کے کرم سے سات بیٹے ہوئے ہیں۔ایک وفات سے دوسرے دن فوت ہو گیا تھا۔ ایک بیٹا محمد طیب ستائیس سال کی عمر میں فوت ہوا تھا اسکی ایک بچی بھی تھی۔اسامہ اور عبد الصبور ادھر ہی پڑھاتے ہیں۔ایک مزدوری کرتا ہے۔ایک بہاولپور میں پروفیسر ہے۔ایک لڑکیوں کا سکول چلاتا ہے۔اور پانچ بچیاں ہیں۔سب شادی شدہ اور خوش وخرم ہیں۔

سوال: شیخ محترم! آپ خود تو حفظ نہیں کر سکے تو آپکی اولاد میں سے کوئی حافظ ہے؟

جواب: ہمارے علاقے میں کوئی اہل حدیث کا ایسا ادارہ نہیں تھا جہاں تجوید کا اہتمام ہو۔ اس لیے مجھے قرآن کے بارے افسوس ہی رہا۔ میرے بچے بھی نہیں کر سکے۔ لیکن پوتے کر رہے ہیں۔ بڑی بیٹی کے تین بیٹے حافظ ہیں۔ دو ابھی کالج میں پڑھتے ہیں۔ ایک عالم ہے۔ رمضان میں قرآن تینوں سناتے ہیں۔ ایک پوتے کو بہاولپور داخل کرایا ہے قاری صاحب صرف ذہین بچہ لیتے ہیں ایک سال میں حفظ کرا دیتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ پانچ ہزار فیس بھی ہے۔ اس ادارے کا معیار اچھا ہے۔ اسامہ صاحب بھی اپنے بچے کو مڈل کے بعد حفظ کروائیں گے۔ ان شاء اللہ

سوال: علمی مصروفیت کی وجہ سے گھریلو امور پر تو کوئی اثر نہیں ہوا؟

جواب: ہمارے معاملات اتنے گنجلک تو نہیں ہیں کہ زیادہ پریشانی آئے۔ ہلکا پھلکا گھر کا کام ہوتا تھا۔ اہلیہ محترمہ میرا پورا ساتھ دیتی تھیں۔ اللہ انکی مغفرت فرمائے۔ آمین

عدم رسوخ

سوال: پرانے علماء میں طب، ادب اور شعر کا بہت ذوق تھا مگر آج کل یہ چیز نظر نہیں آتی؟

جواب: پہلے کتب بینی کی طرف توجہ زیادہ تھی اور آج کل زیادہ توجہ انٹرنیٹ والی بیماری کی طرف ہو گئی ہے۔ پہلے یہ تاثر تھا کہ منطق، فلسفہ اور لغت عرب یہ تین مضمون علمی رسوخ کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ شعراء کا کلام، منطق اور فلسفہ جس کے پاس نہیں ہے وہ عالم نہیں ہے۔ اس لیے اساتذہ کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ نئے طالب علم تیار کیے جائیں۔ شیخ محترم رحمہ اللہ نے مجھے منطق و فلسفہ خود پڑھایا تھا۔ جب آپ کو مولانا شریف اللہ خان سواتی رحمہ اللہ کا پتہ چلا تو آپ نے مجھے اسی نظریے کے تحت ان کے پاس بھیجا۔ اَدق کتب پڑھنے کو علمی رسوخ کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا مگر آج کل سہل پسندی آچکی ہے جس کی وجہ سے علمی رسوخ نہیں ہوتا۔

مختارات

سوال: تاریخ علماء اہل حدیث پر کس مصنف کو پسند کرتے ہیں۔؟

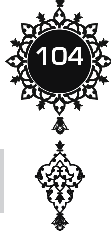
جواب: سب سے زیادہ کام مولانا اسحاق بھٹی صاحب رحمہ اللہ کا ہے۔ رمضان سلفی صاحب نے بھی اچھا کام کیا ہے۔ مگر زیادہ مستند کام عبد الرشید عراقی صاحب کا ہے۔ بڑا زبردست اور اچھا انداز ہے۔ جوبات لکھتے ہیں بڑی پختہ ہوتی ہے۔



سوال: مقرر کونسا پسند ہے؟

جواب: مجھے مولانا عبد الخالق رحمانی صاحب رحمہ اللہ پسند تھے وہ بہت اچھا بولتے تھے۔ ان کی الفاظ پر اچھی گرفت تھی اور ار دو ادب بہت زبردست تھا۔ اور یہ ہی دو چیزیں مؤثر ہوتی ہیں۔ اس کے بعد علامہ احسان الہی ظہیر صاحب رحمہ اللہ کا انداز بھی بڑا پیارا ہے۔ اگرچہ زیادہ سیاست پر بولتے تھے۔ لیکن علمی حیثیت کے مالک تھے۔ ان کی بغداد والی تقریر میں نے سنی جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔





سوال: آپ کا پسندیدہ موضوع کیا ہے؟

جواب: میرا پسندیدہ موضوع علم الحدیث اور اس کے متعلق موضوعات ہیں۔ دن رات اسی میں گزرتا ہے۔ اس وجہ سے میں نے اصول حدیث پر بہت دلچسپی سے لکھا ہے۔ الفیۃ الحدیث للعراقی کے حواشی اسی سلسلہ کا حصہ ہے۔ اسی طرح اصول حدیث کی کتاب اسبال المطر بھی پہلے میں نے ہی چھپوائی تھی بعد میں دار السلام نے طبع کی تھی۔



سوال: کھانے پینے اور لباس میں کیا پسند فرماتے ہیں؟

جواب: اپنے لیے سفید لباس پسند کرتا ہوں۔ جوانی کی عمر میں شاید کوئی اور رنگ استعمال کیا ہو ورنہ سفید ہی استعمال کرتا ہوں۔ سفید رومال، سفید قمیص اور سفید شلوار۔ کھانے پینے میں بس سادہ غذا۔ اور کچھ نہیں۔

سوال: خضاب کے بارے کیا فرماتے ہیں؟

جواب: سیاہ خضاب کو تو میں جائز ہی نہیں سمجھتا باقی خضاب استعمال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں جائز ہے فرض نہیں ہے۔ البتہ ایک دفعہ ضرور استعمال کرنا چاہیے تا کہ یہود کی مخالفت ہو سکے۔ میں نے بھی ایک بار لگایا تھا۔

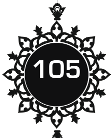


کھیل



سوال: شیخ محترم! دوران تعلیم آپ کون سی کھیل کھیلتے تھے؟

جواب: عصر کے بعد فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے علاقے میں سیلاب آتا تھا۔ جس میں تیراکی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں ایک جھیل ہوتی تھی اس میں تیراکی کرتے تھے۔ کچھ عرصہ والی بال بھی کھیلتے رہے ہیں۔



تاریخ



سوال: تاریخ اسلامی کے لیے کون سی کتب زیر مطالعہ ہونی چاہئیں؟

جواب: تاریخ میں پوری زندگی آتی ہے۔ مسلم قوم کی پوری زندگی قرآن اور احادیث صحیحہ میں موجود ہے۔ یہ سب سے معتبر اور مستند ذخیرہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر الگ سے کام ہوا ہے۔ تفصیلات کے لیے اسد الغابہ، الاصابہ اور الاستیعاب وغیرہ ہیں۔ رجال کی تاریخ پر بھی محدثین نے شاندار تصانیف چھوڑی ہیں۔ بادشاہ و ملوک اور دیگر حالات پر البدایۃ و النہایۃ اور ابن خلدون وغیرہ۔ لیکن ان میں صحیح روایات کی پابندی نہیں کی گئی۔ اور اب دار السلام کی طرف سے سیرت انسائیکلوپیڈیا کی طباعت مفید اقدام ہے۔ جس میں جامعیت کا اہتمام کیا گیا ہے۔



روحانیت اور تصوف

سوال: شیخ محترم! تصوف اور روحانیت کے بارے کیا خیال ہے؟

جواب: ہم اس روحانیت اور زھد کے قائل ہیں جس کی بنیاد کتاب وسنت ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نفل نماز ذکر اذکار اور دعائیں سکھائی ہیں یہی زھد ہے۔ ابن تیمیہ اور ابن القیم رحمہا اللہ نے یہی اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب بدعی تصوف ہیں۔

جرح وتعدیل کا بڑھتا ہوا رجحان

سوال: شیخ محترم! نقد رجال اور تحقیق کی جو لہر نوجوان علماء میں پیدا ہو رہی ہے اس بارے آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: ہمارے لوگ مبالغہ کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس حد تک درست نہیں ہے۔ اکابرین بہت کام کر چکے ہیں۔ تھوڑی بہت تنقید ہر ایک پر ہوتی ہے۔ یہ سیدھا کر اس لگا دیتے ہیں۔ میں اسکی مثال دیتا ہوں بین السجدتین والی "اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي وَارْحَمْنِي وَعَافِنِي وَاهْدِنِي وَارْزُقْنِي" اس میں حبیب بن ابی ثابت راوی مدلس ہے۔ وہ عن سے روایت کر رہا ہے۔ جبکہ ایک صحیح سند سے یہی دعا سنن ابو داود وغیرہ میں ہے۔ کہ ایک اعرابی صحابی رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا آپ ﷺ نے ان کو نماز میں پڑھنے کے لیے یہی دعا سکھائی۔ اس میں نماز کے کسی حصہ کی صراحت تو نہیں ہے۔ لیکن اس نماز کا ذکر ہے۔ تو اس سے تدلیس کا شبہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے علماء کرام نے کہہ دیا کہ یہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ حالانکہ ہمارے اکابر علماء کرام نے اس دعا کو پڑھا ہے۔ سب نے اپنی کتب میں لکھا ہے۔ یہ ساری باتیں میں نے التعلیق النجیح میں لکھ دی ہیں۔

اسی طرح ایک بار شیخ صاحب رحمہ اللہ اور میں جامعہ سلفیہ اسلام آباد امتحان لینے گئے۔ وہاں سے ہم ایوبیہ چلے گئے راستے میں ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ تعارف ہوا اس نے بتایا کہ وہ بھی اہل حدیث ہے اور فوج میں کرنل ہے۔ اس نے اپنے اہل حدیث ہونے کا واقعہ بتایا کہ ایک دن دوران پریڈ مجھے خیال آیا کہ ہم کس قدر نظم وضبط کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ سیدھی صف

بناتے ہیں۔ اور اللہ نے بھی حکم دیا ہے کہ میرے سامنے صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھو لیکن ہم صف بنا کر نماز نہیں پڑھتے۔

میں نماز کو جاننے کے لیے فوج کی لائبریری میں گیا۔ نماز والی کسی کتاب کا مطالبہ کیا تو مجھے مولانا صادق سیالکوٹی رحمہ اللہ کی کتاب صلوٰۃ الرسول دی گئی۔ میں پڑھتا گیا تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ کہ ہمارے لوگ غلط کر رہے ہیں۔ اسی کے مطابق میں نے نماز شروع کر دی تو اہل حدیث ہو گیا۔ اب اس کتاب پر جرح کر کے بہت سی روایات کو ضعیف کر دیا گیا ہے جس سے کتاب کی افادیت ویسی نہیں رہی۔

چند اعیان کا تذکرہ

مولانا سلطان محمود محدث جلالپوری رحمۃ اللہ علیہ

سوال: شیخ محترم! ہمیں محدث جلالپوری رحمہ اللہ کے بارے کچھ بتائیں خاص طور پر ان کا انداز تدریس؟

جواب: ابن ماجہ اور چند ایک ابتدائی کتب کے علاوہ میں نے ساری کتابیں شیخ محترم رحمہ اللہ سے پڑھی تھیں۔ شیخ محترم سے وابستہ یادیں میں نے شیخ محترم کی سوانح عمری میں درج کر دی ہیں۔ آپ دوران تدریس درج ذیل امور کو مدنظر رکھتے تھے۔

1. سب سے پہلے تو عبارت کا لغوی اور صرفی ونحوی حل کرتے تھے۔ بلکہ طلباء سے کرواتے تھے۔ شیخ محترم کوئی بھی اہم لفظ آجاتا اس کی مکمل تحلیل طلباء سے کرواتے تھے۔ اگر ان کو نہ آتا تو احساس دلانے کے لیے چھوٹی کلاس کو بلا کر پوچھ لیتے تھے۔ اسی طرح اعرابی غلطی بالکل گوارا نہیں کرتے تھے۔ اور ترکیب بھی کرواتے تھے۔ بعض اوقات حدیث کے دیگر اساتذہ کو بلا لیتے اور کہتے کہ یہ لفظ فلاں کتاب میں آیا ہے۔ اور وہ آپ نے پڑھائی ہے لیکن اس طالب علم کو یہ لفظ نہیں آرہا۔ (اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت تعلیم پہ کس قدر توجہ ہوتی تھی)۔

2. اس کے بعد ترجمہ کرتے تھے۔ شیخ محترم رحمہ اللہ سے اگر ایک لفظ کا کئی بار بھی ترجمہ پوچھا جاتا تو آپ نے کبھی ناگواری محسوس نہیں کی۔ اگلے صفحے پر دوبارہ اگر پوچھا جاتا تو بتا دیتے تھے

کبھی انکار نہیں کرتے تھے۔

3 حدیث اور ترجمۃ الباب میں مطابقت بھی خصوصی توجہ کا مرکز رہتی تھی۔

4 فقہی مسائل میں بین المسالک کے حوالے سے محدثین کے طرز پر چلتے تھے۔

5 رجال کے بارے مفید کتب کی طرف راہنمائی کرتے تھے۔

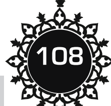


سوال: آپ نے دوران تدریس یہ انداز اپنایا ہے یا کچھ تبدیلی کی ہے؟

جواب: میں نے مکمل وہی انداز اختیار کیا ہے۔ اور ایک دو چیزوں کا اضافہ کیا ہے۔ جن صحابہ کرام اور رواۃ کو ناموں کی بجائے کنیت اور نسبت سے ذکر کیا گیا ہے ان کے اصل نام اور وجہ نسبت و کنیت یاد کرواتے ہیں۔ دوبارہ آجائے تو طلباء سے پوچھتے ہیں۔ اسی طرح اہم رواۃ کا تعارف بھی بچوں کو ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ یہ چیز مجھے فیض الرحمٰن الثوری رحمہ اللہ کی ترغیب سے حاصل ہوئی تھی۔



فیض الرحمٰن الثوری رحمۃ اللہ علیہ



سوال: فیض الرحمٰن الثوری رحمہ اللہ آپ کے استاد ہیں یا فقط ہم عصر؟

جواب: ان سے باقاعدہ کچھ نہیں پڑھا تھا۔ البتہ رجال کے بارے میں ہماری بہت رہنمائی کرتے تھے۔ یہ 1940ء سے پہلے فارغ ہو کر دہلی چلے گئے تھے وہاں سے پڑھ کر آئے تو بہاولپور جامعہ عباسیہ سے علامہ کی ڈگری حاصل کی۔ جس کے ذریعے ریاست بہاولپور میں ملازمت بھی کرتے رہے۔ جب چھٹیاں ہوتیں تھیں تو رجال و حواشی پر کام کرتے تھے۔ ان کا بہت سارا کام ابھی تک چھپ نہیں سکا۔ مجھے ان کا انتہائی وقیع کام ملا ہے۔ جامع الترمذی اور تحفۃ الاحوذی پر حواشی ہیں۔ یہ رش السحاب کے علاوہ ہے۔ میری کوشش ہے کہ انکی تمام کتب چھپ جائیں اور آج کل بھی میں مصنف ابی یعلی کے ساتھ ساتھ ان کی حواشی والی کتاب پر کام کر رہا ہوں۔





سوال: ان کو ثوری کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب: یہ بلوچ تھے اور دھیرہ میں رہتے تھے۔ سکھوں کے حملے کی وجہ سے چھوڑ آئے تھے اور یہاں آ کر یہ بڑے بڑے بیلوں پر مزدوریاں کرتے تھے۔ سرائیکی میں بیل کو ڈھاند کہتے

ہیں۔ان کے قبیلے کو ڈھاندی بلوچ کہا جانے لگا۔انہوں نے اس کا عربی ترجمہ کر کے اپنے نام کا حصہ بنالیا۔

سوال: ان کی کتاب الرد التقی بھی آپ کے پاس ہے؟

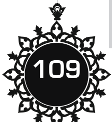
جواب: ثوری صاحب رحمہ اللہ یہاں اس پر کام کرتے رہے تھے۔ پھر پیر بدیع الدین شاہ راشدی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس چلے گئے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد جہلم چلے گئے۔ ادھر بھی وہ اس کتاب پر کام کرتے رہے۔ ابھی وہ کتاب اسلم شاہد روی صاحب حفظہ اللہ کے پاس ہے۔ کمپوزنگ ہو چکی ہے۔ چھپنے کا کام ابھی باقی ہے۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے ایک رسالہ فیض الرحمٰن الثوری میں وضاحت کی ہے۔





مولانا عبد الشکور شاہ اثری صاحب رحمہ اللہ

سوال: شیخ محترم! شاہ عبد الشکور اثری صاحب رحمہ اللہ کے بارے آگاہ فرمائیں؟



جواب: وہ میرے ہم کلاس تھے۔ اکٹھے پڑھتے تھے۔ بڑے مخلص ساتھی تھے۔ زھد و تقویٰ میں ان کا ایک مقام تھا۔ دنگل (میلہ) میں پہلوانوں کی کشتی ہوتی تھی۔ ہم نے شاہ صاحب کو بھی ساتھ لے لیا تاکہ استاد جی پوچھیں تو شاہ صاحب کی وجہ سے ہم بھی بچ جائیں گے۔ بڑی مشکل سے ان کو منایا۔ واپس آئے تو شیخ محترم کے سامنے سب کی پیشی لگ گئی۔ شیخ محترم کے سامنے سب چپ تھے۔ شیخ محترم نے اتنا کہا: عبد الشکور شاہ تساں ای گیا ویں؟ (آپ بھی گئے تھے؟) وہ صرف اسی بات پر دو دن روتے رہے۔ ہم نے شیخ صاحب کو بتایا۔ شیخ صاحب نے ان کو تسلی دی تو وہ نارمل ہوئے۔





مولانا اللہ یار صاحب رحمہ اللہ

سوال: مولانا اللہ یار صاحب رحمہ اللہ کے بارے کچھ معلومات دیں؟

جواب: جس سال میں نے پڑھانا شروع کیا تھا مولانا اللہ یار صاحب اس سال پڑھنے کے لیے آئے تھے۔ ابتدائی کتب تقریباً ساری مجھ سے پڑھی ہیں۔ انتہائی ذہین، محنتی، اطاعت شعار اور زاہد تھے۔ شیخ محترم نے ان کے ذمہ ترجمہ تفسیر لگایا تھا جس میں ان کو خاص درک حاصل

تھا۔ اور انہوں نے آخر عمر تک یہ پڑھایا اور اس کا حق ادا کیا۔

نظریہ پاکستان اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ

سوال: شیخ محترم! آپ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ سے کافی متاثر ہیں تو ان کے نظریہ تقسیم ہند سے بھی متفق ہیں؟

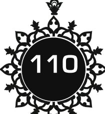


جواب: وہ ابو الکلام آزاد رحمہ اللہ کے ہمنوا تھے۔ لیکن جب ملک بن گیا تو وہ کہتے تھے۔ اب پاکستان بن گیا ہے اب اسکی حفاظت کرنی چاہیے۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی اپنے ساتھیوں کو پاکستان بھیج دیا تھا۔ لیکن ہمارا ذہن دو قومی نظریہ ہی کے ساتھ ہے۔



مدارس کا نصاب

سوال: نصف صدی سے آپ تدریس کر رہے ہیں! آپ کے خیال میں مدارس کے نصاب میں اصلاحات ہونی چاہئیں؟



جواب: مدارس کے نصاب میں تاریخ اور جغرافیہ کا اضافہ ہونا چاہیے۔ اور علوم وفنون میں اس قدر سہولت نہیں ہونی چاہیے کہ سارا سسٹم ہی کمزور رہ جائے۔ جیسا کہ آج کل نئی نئی کتابیں شامل نصاب کر کے کیا جا رہا ہے۔



ایسی کتابیں شامل نصاب ہونی چاہیں جن سے طلباء کے ذہن علمی طور پر تیار ہو سکیں۔

طلباء کو نصیحت



سوال: علوم اسلامیہ کے طلباء کو کیا نصیحت فرمائیں گے؟

جواب: طلباء کو چاہیے کہ کتب بینی کا شوق پیدا کریں نہ کہ نیٹ کا۔ تحقیق و ریسرچ کے لیے کتب کو کنگھالنے کی کوشش کریں۔ اس سے علم میں پختگی پیدا ہو گی۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اور طلباء کو چاہیے کہ مواضع الاتہام سے دور رہیں۔ اس سلسلے میں سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا والی روایت مد نظر رکھنی چاہیے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو صحابہ کو بتلایا

تھا کہ یہ میری بیوی میرے ساتھ جا رہی ہے۔

اساتذہ کے لیے نصیحت

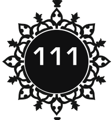
سوال: شیخ محترم! مدرسین کو کیا نصیحت کریں گے؟



جواب: مدرسین کو اس وقت سبق پڑھانا چاہیے جب خود کو سمجھ آ جائے۔ ڈھکوسلے سے نہیں پڑھانا چاہیے۔ طلباء کے سامنے اردو کتب سے مطالعہ نہ کریں۔ اگر ضرورت ہو تو علیحدگی میں دیکھے۔ طلباء پر اس چیز کا اچھا تاثر نہیں پڑتا۔



طلباء سے عبارت سنیں تو اعراب پر خصوصی توجہ دیں۔ اس میں صرف کی تصحیح بھی ہوتی جائے گی اور نحو کی بھی۔ کوئی طالب علم ترجمہ پوچھتا ہے تو اسے نظر انداز مت کریں۔ اس پر توجہ دیں۔ اور آخری بات یہ ہے کہ طلباء پر سختی نہ کریں انہیں افہام و تفہیم سے پڑھائی کے لیے قائل کریں۔ سختی سے اچھے نتائج نہیں سامنے آتے۔



تلامذہ



سوال: آپ کے خاص تلامذہ کون سے ہیں؟

جواب: جو شیخ صاحب کے پاس پڑھتے رہے وہ ہمارے بھی شاگرد ہیں۔ ان میں سے مولانا اللہ یار صاحب رحمہ اللہ، ادریس اثری صاحب، عبد الستار حماد صاحب، عبد الرحمان چیمہ صاحب، عمر فاروق سعیدی صاحب، سعید مجتبیٰ سعیدی صاحب، ابو نعمان بشیر احمد صاحب، عبد الرحمن شاہین صاحب اور عبد الغفار اعوان صاحب وغیرہ ہیں۔ حفظہم اللہ



اجازۃ الروایۃ

سوال: کچھ طلباء اجازات کا بہت اہتمام کرتے ہیں! کیا یہ چیز مفید ہے؟

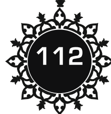
جواب: اجازۃ الروایۃ اس طرح مفید ہے کہ طالب علم کا حدیث اور محدثین کے ساتھ تعلق اور مضبوط ہو جاتا ہے۔ احساس ہوتا ہے کہ میں بھی اسی سلسلے کا ایک فرد ہوں۔ اساتذہ کو بھی چاہیے کہ جس کے بارے خیال کریں کہ وہ اس میدان میں کام کر سکتا ہے۔ اس کو سند دے دیں۔

سوال: اپنے اجازۃ الروایۃ کے بارے میں بتلائیں؟

جواب: میری جو عالی سند ہے وہ مولانا عبد الحق ہاشمی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ہے۔ آپ 1948ء یا 49ء میں یہاں سے چلے گئے تھے۔ میں آپ کو مل نہیں سکا اس لیے اجازۃ عامہ کے طور پر ان کی سند میرے پاس ہے۔ آپ نے مسند الصحیحین کے مقدمہ میں ایک سند درج کر کے کہا ہے کہ یہ سب سے عالی سند ہے۔ اور ساتھ اجازۃ عامہ بھی دے دی ہے کہ جو لوگ اس وقت زندہ ہیں اور حدیث پر کام کر رہے ہیں وہ میری طرف سے بیان کر سکتے ہیں۔ اور میں ان دنوں حدیث کی کتب پڑھا رہا تھا۔ شیخ محترم رحمہ اللہ کی سندیں میرے پاس ہیں۔ ان سے براہ راست لی ہیں۔ میں نے اپنی مطبوع سند میں وہ سب درج کر دی ہیں میاں نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچا دی ہیں۔ اس سے آگے سند معروف ہے۔











ایک بار لیبیا سے شیخ عمر صاحب ملتان میں حافظ عبد المنعم صاحب کے پاس آئے۔ کہا کہ مجھے ان پندرہ روایات کی تخریج مطلوب ہے مجھے کسی عالم کے بارے بتاؤ جو یہ کام کر سکے۔ انہوں نے میرے پاس بھیج دیا۔ میں نے ان کا کام کر دیا اور باتوں باتوں میں کہا کہ مؤطا پر زیادہ مغربی علماء نے کیا ہے۔ جو لیبیا اور مراکش وغیرہ میں آباد ہوئے۔ میں نے بھی مؤطا پر کام کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے کسی مغربی عالم سے سند حاصل ہو۔ انہوں نے میری بات ذہن میں رکھی اور تیونس کے شیخ محمد شاذلی صاحب سے بات کی۔ انہوں نے مجھے خط لکھا کہ آپ نے مغربی عالم سے سند کی خواہش کی ہے میں آپ کو سند دیتا ہوں اور السبت الصغیر کے نام سے آٹھ صفحات میں اپنی سند بھیجی جو سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ تک المسلسل بالاولویۃ ہے۔ یہ سند میرے خیال میں پاکستان میں صرف میرے پاس ہی ہے۔ چونکہ پاکستان میں سب سے پہلے یہ میرے پاس آئی ہے۔ اس لیے میں نے بھی لکھ دیا کہ میرے لیے بھی المسلسل بالاولویۃ ہے۔

سوال: آپ کی اجازۃ الروایۃ کے لیے کیا شرائط ہیں؟

جواب: جو آدمی علم حدیث پڑھ چکا ہے اور پڑھ رہا ہے یا علم حدیث سے دلچسپی رکھتا ہے اس کو میں سند اجازۃ دے دیتا ہوں وہ مجھ سے بیان کر سکتا ہے۔

سبحانک اللھم وبحمدک أشھد ان لا الہ الا أنت استغفرک وأتوب الیک